ماہنامہ

پونم

حیدر آباد

اشاعت کا بیسواں سال
جنوبی ہند کا کثیر الاشاعت علمی، ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

ڈاکٹر زینت ساجدہ نمبر

ایڈیٹر
ناصر کرنولی ایم۔ اے (عثمانیہ)

جون، جولائی ○ ۱۹۸۳ء

جلد (۲۰) ○ شمارہ (۵) ○ زرِ سالانہ (۳۰) روپے ○ لائبریریز کے لیے (۳۵) روپے
بیرونی ممالک سے (۱۲) ڈالر ○ فی پرچہ (۱۰) روپے ○ لائبریریز کے لیے (۱۵) روپے

خط و کتابت کا پتہ : مینیجر ماہنامہ پُونم 16-7-300/1 اعظم پورہ، حیدرآباد ۲۴

○

★ سرورق پر ڈاکٹر زینت ساجدہ کا بلاک بشکریہ اردو اکیڈمی حیدرآباد

○

طباعت : دائرہ پریس چھتہ بازار، حیدرآباد ۲

نیک تمناؤں کے ساتھ
دی وزیر سلطان
ٹوبیکو کمپنی لمیٹیڈ
اعظم آباد۔ حیدرآباد
500020

ترتیب

کنجی ـــــ اداریہ ـــــ ناصر کرنولی ـــــ ۷
قطعۂ تاریخ ـــــ طبع زینت ساجدہ نمبر ـــــ صاحب حیدرآبادی ـــــ ۸
عکس تحریر ـــــ ڈاکٹر زینت ساجدہ ـــــ ۹
ڈاکٹر زینت ساجدہ کی فوٹو آفسٹ تصاویر ـــــ ۱۱ تا ۱۴

ــ (اہلِ قلم حضرات کی تخلیقات) ــ

ڈاکٹر زینت ساجدہ کی تین تصانیف ـــــ ڈاکٹر سیدہ جعفر ـــــ ۱۵
نذر زینت ساجدہ ـــــ (نظم) ـــــ سید مظفر الدین خاں صاحب حیدرآبادی ـــــ ۱۸
رباعیات ـــــ صاحب حیدرآبادی ـــــ ۱۸
میرے گھر کی بہو ـــــ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ـــــ ۱۹
بھائی کا ہدیۂ خلوص بہن کی خدمت میں ـــــ (نظم) ـــــ سعید شہیدی ـــــ ۲۲
زینت ساجدہ ـــــ خواجہ عبدالغفور ـــــ ۲۳
ایک آواز ایک تاثر ـــــ عاتق شاہ ـــــ ۲۵
زینت ساجدہ ـــــ (نظم) ـــــ رحمن جامی ـــــ ۳۳
ایک خط ـــــ اقبال متین ـــــ ۳۴
ایک شاگرد کا نذرانۂ عقیدت ـــــ (نظم) ـــــ صلاح الدین نیر ـــــ ۳۸
جب تک چاند ستارہ ہاتھ اٹھائے مصروف دعا ہے ـــــ ڈاکٹر مجاور حسین ـــــ ۳۹
جادو بیاں ـــــ جادو نگار ـــــ مرزا ظفر الحسن ـــــ ۴۱
زینت ساجدہ ـــــ اے۔ جی۔ فاروقی ـــــ ۴۵

نازشِ دکن زینت ساجدہ (نظم) — مومن خاں شوق — ۴۸

زینت ایک دوست — ممتاز جیب — ۴۹

گونجتی آواز (نظم) — امۃ الکریم خورشید نذیر — ۵۲

ڈاکٹر زینت ساجدہ اور ان کے افسانے — اکرام جاوید — ۵۳

زینت ساجدہ کا رختِ سفر — ڈاکٹر ناصرہ فضل اللہ — ۵۷

معاش مکرز زینت کی دو زمانہ تست — رفیع رؤف — ۶۹

یادوں کے دیئے — لئیق صلاح — ۷۵

ہدیۂ تہنیت (نظم) — حفیظ الناصری — ۸۲

زینت آپا — بیگ احساس — ۸۳

زینتِ اوراق — اوراقِ زینت

ڈاکٹر زینت ساجدہ سے ادبی گفتگو (انٹرویو) — وقار خلیل — ۸۹

ڈاکٹر زور تحقیق کے میدان میں — ڈاکٹر زینت ساجدہ — ۹۷

من ترا حاجی بگویم — ڈاکٹر زینت ساجدہ — ۱۰۱

چلی گئی گرمی... جب بیلا پھولے آدھی رات (انشائیہ) — ڈاکٹر زینت ساجدہ — ۱۰۵

میری مرغیاں (طنزیہ انشائیہ) — ڈاکٹر زینت ساجدہ — ۱۰۹

کیا وقت ہے (افسانہ) — ڈاکٹر زینت ساجدہ — ۱۱۳

جشن زینت ساجدہ کا آنکھوں دیکھا حال — وقار خلیل — ۱۱۹

(اداریہ)

ڈاکٹر زینت ساجدہ نمبر ہدیۂ ناظرین ہے۔

اس خاص نمبر کے ساتھ ماہنامہ پونم نے اپنی زندگی کے انیس سال مکمل کر لیے ہیں۔ اب تک پونم نے تعمیری اور تخلیقی ادب پیش کرتے ہوئے زبان و ادب کی جو بھی بڑی خدمت کی ہے وہ ارباب فکر و نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ عام شماروں کے علاوہ پونم نے کئی منفرد اور یادگار خصوصی اشاعتیں بھی پیش کی ہیں جن کو ادب میں دستاویزی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ زیر نظر خاص نمبر بھی اسی سلسلے کی ایک اور اہم کڑی ہے۔

ڈاکٹر زینت ساجدہ اردو ادب کے حق میں ایک محترم اور مستند شخصیت کی حامل ہیں۔ محقق، نقاد، انشائیہ نگار اور کہانی نویس کی حیثیت سے ان کی تحریریں اردو والوں کے لئے جانی پہچانی ہیں۔ آج سے دو سال قبل ڈاکٹر صاحب کے شاگردوں اور عقیدتمندوں نے شاندار پیمانے پر "جشن زینت ساجدہ" کا انعقاد کیا تھا جو سچ پوچھئے تو حیدرآباد کے علمی، ادبی اور تہذیبی حلقوں کی ادب نوازی ہی نہیں بلکہ ادب شناسی کا بھی مثالی ثبوت ہے۔ جشن کے موقع پر ایک سووینر کی اشاعت بھی عمل میں آئی تھی جس میں ڈاکٹر زینت ساجدہ کی شخصیت اور فن سے متعلق چند گرانقدر مضامین شامل تھے۔ دو چار مضامین میں ان تمام خوبیوں اور خامیوں کا احاطہ کرنا جن سے کہ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت عبارت ہے ممکن نہیں تھا۔ اس تشنگی کو محسوس کرتے ہوئے ماہنامہ پونم کی خصوصی اشاعت کا اعلان کیا گیا۔ ہماری خواہش تھی کہ ایک ایسا نمبر پیش کیا جائے جو ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اور فن کے تعلق سے مکمل ہو۔ اپنے محدود وسائل کے باوجود ہم اپنی کوششوں میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں اس کا فیصلہ پونم کے قارئین اور معتبر ناقدین ہی کر سکیں گے۔

خاص نمبر کی ترتیب کے سلسلے میں جن باتوں کا شدت سے احساس ہوا اس کا اظہار بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ لوگ شہرت کے لئے منصوبہ بند طریقے اختیار کرتے ہیں اور معمولی سے معمولی کارناموں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کے عادی ہوتے ہیں لیکن اس خصوص میں ڈاکٹر زینت ساجدہ کی شخصیت قدرے بے نیاز نظر آتی ہے۔ اپنی تصانیف اور تخلیقات کے تعلق سے اردو ادب کے مستند نقادوں کی تعریفیں، تنقیدیں اور تبصرے ہی نہیں خود اپنی تحریریں، مسودے اور وہ رسائل جن میں مضامین چھپے ہیں ان کے پاس محفوظ نہیں ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کے مضامین، کہانیوں اور انشائیوں کی تعداد کا اندازہ کرنا ممکن نہیں۔ اور بعض بہترین تخلیقات تک رسائی بھی نہیں ہو سکی۔ تاریخی نوعیت کی کانفرنسوں اور کنونشنوں (جن کی ڈاکٹر صاحب صدارت کر چکی ہیں) کی تصاویر سے ان کا البم بڑی حد تک خالی ہے۔ زیر نظر خاص نمبر کی بیشتر تصویریں ڈاکٹر صاحبہ کے دوست احباب کی فراہم کردہ ہیں۔ شاگردوں اور ریسرچ اسکالروں کے تقاضوں کی تکمیل نے ڈاکٹر صاحب کو بے حد عدیم الفرصت بنا دیا ہے۔

پُرخلوص رہنمائی کی بدولت ان کے کئی شاگردوں کا شمار عصر حاضر کے بلند قامت ادیبوں میں ہونے لگا ہے ڈاکٹر صاحب کی عدیم الفرصتی اور طبیعت کی بے نیازی خاص نمبر کے سلسلے میں کبھی کبھی عدم تعاون کا احساس بھی جگاتی رہی ہے اس پس منظر میں اگر آپ پونم کے اوراق کا جائزہ لیں گے تو آپ کو یقیناً ہماری ان دشواریوں اور مجبوریوں کا اندازہ ہو جائے گا۔ جو خاص نمبر کی اشاعت میں تاخیر کا سبب بنی ہیں۔
ناسپاسی ہوگی اگر میں ان تمام اہل قلم حضرات کا شکریہ ادا نہ کروں جن کی تخلیقات زینت نمبر کی زینت ہیں۔ میں اپنے پرخلوص دوستوں، شاگردوں اور پونم کے بہی خواہوں کا بھی تہہ دل سے شکرگزار ہوں جن کے تعاون کے بغیر خاص نمبر کو منظر عام پر لانا ایک مشکل مرحلے سے کم نہیں تھا۔ مجھے یقین ہے کہ سوا سو صفحات پر مشتمل پونم کا یہ خاص نمبر اپنی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے قارئین اور ناقدین کی پسندیدگی حاصل کرنے میں کامیاب رہے گا ——— ناصر کرنولی (مدیر)

قطعۂ تاریخ ـــــ طبع زینت ساجدہ نمبر

نتیجۂ فکر
صاحب حیدرآبادی

ہے ادب کا یہ شمارہ بے بدل
روشنی "پونم" کی پھیلی چار سو
طبع کی تاریخ صاحب یہ بلی
صدر زینت خاص نمبر دیدہ رُو

جناب صاحب حیدرآبادی نے پونم کے ڈاکٹر زینت ساجدہ نمبر کی اشاعت سے متعلق قطعۂ تاریخ مرحمت فرمایا ہے جس کیلئے ادارہ شکر گزار ہے۔ (ادارہ)

اُردو دوستوں سے ...؟

اگر آپ اردو دوست ہیں تو اردو رسائل خرید کر پڑھا کیجئے اور اپنے دوستوں کو بھی خرید کر پڑھنے کی ترغیب دیجئے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اردو والوں میں قوت خرید نہیں ہے۔ جو صحیح نہیں ہے۔ دراصل ہم اردو والے اعزازی اور رسالے مانگ کر پڑھنے کے عادی ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے ادبی رسائل کی تعداد دن بدن گھٹتی جا رہی ہے۔ کئی معیاری رسائل دم توڑ چکے ہیں اور جو باقی ہیں وہ بھی موت اور زندگی کی کشمکش سے دو چار ہیں۔ ادبی رسائل اردو ادب کی رفتار ترقی کے ضامن ہوتے ہیں اور ان سے بے اعتنائی اردو زبان و ادب سے بے اعتنائی کے مترادف ہے۔ اس سلسلے میں ہندوستان کے مختلف صوبوں میں قائم شدہ اردو اکیڈمیوں کو نہایت ہی سنجیدگی کے ساتھ غور کرتے ہوئے ایسی راہیں تلاش کرنے کی ضرورت ہے جن پر گامزن ہو کر ادبی رسائل ترقی کی منزلیں طے کر سکیں۔ (ادارہ)

میاں ناصر

کمال کرتے ہو، یہ زینت ساجدہ نمبر نکالنے کی کیا سوجھی؟
اخباروں اور رسالوں کے اڈیٹروں کو گھاٹے کا سودا کرتے نہیں دیکھا۔
لیکن تم تو سراسر گھاٹے کا سودا کر رہے ہو۔ اب بھی وقت ہے،
ٹال جاؤ — میں یہ بات تکلف میں کہہ رہی ہوں نہ مصلحت سے۔ اس لئے
کہ یہ دونوں باتیں میری زندگی میں کبھی بار نہ پاسکیں۔ جس کی وجہ سے
بڑے نقصان اٹھانے پڑے ہیں۔

نمبر نکالتے ہیں اُن کا جو اشتہار فراہم کرتے ہیں۔ عطیہ دلاتے ہیں،
خریدار بناتے ہیں۔ اور تم جانتے ہو میں ان میں سے کوئی کام نہیں کرسکتی۔
یہ میرے بس کا روگ نہیں۔ پھر تم کس برتے پر نمبر نکال رہے ہو؟
مانا کہ میرے مداحوں اور شاگردوں کا دایرہ بہت وسیع ہے۔
خود تمہارے گھر میں میرے تین جاسوس موجود ہیں — یہ خوش ہوں گے۔
لیکن میرے مخالفین بھی تو ہیں، خاص کر اس پیشے میں جس سے تمہارا تعلق ہے۔
مفت میں ان کی مخالفت کیوں مول لیتے ہو؟ اونچی دوکانوں کے دروازے
اپنے پر بند کرنے پر تلے ہوئے ہو تو اور بات ہے —

مخلص

زینت ساجدہ

نیک تمناؤں کے ساتھ
عذرا اڈورٹائزنگ اینڈ مارکٹنگ
ونایک راؤ بلڈنگ معظم جاہی مارکٹ۔ حیدرآباد
فون: 45509 اور 42620

ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی گولڈن جوبلی تقریب میں تقریر

پروفیسر ونجا آئینگار، ممتاز حبیب، حبیبہ رضوی اور ڈاکٹر زینت ساجدہ

ویمنس کالج میں زائد نصابی سرگرمیوں میں دلچسپی کا ثبوت، فینسی ڈریس میں طالبات اور اساتذہ کے ساتھ ــــ لمبا ڑن ــــ

چیف منسٹر، مسٹر انجیا، بسٹ ٹیچر اوارڈ عطا کر رہے ہیں

مصروفِ مطالعہ

دوسری شامِ غزل، منعقدہ اِسٹینلی اسکول، مولوی حبیب الرحمٰن صاحب اور مرحوم شاہد صدیقی دیکھے جا سکتے ہیں

تمارا گوڑ کی شادی کے موقع پر
راج بہادر گوڑ، برج رانی گوڑ
کے ساتھ
زینت ساجدہ و حسینی شاہد

(نیچے)
پروفیسر رام ریڈی مومنٹو عطا
کر رہے ہیں

ڈاکٹر زینت ساجدہ اور ڈاکٹر حسینی شاہد، ڈاکٹر علیم کے ساتھ

جلسۂ تہنیت ڈاکٹر حسینی شاہد، زینت ساجدہ تقریر کرتے ہوئے، تصویر میں بوگس حیدرآبادی، محمود پاشا قادری اور ڈاکٹر حسینی شاہد

اُردو کانفرنس: دائیں سے بائیں: سجاد ظہیر، پروفیسر محمد مجیب، دگمبر راؤ بندو، بی. رام کشن راؤ، زینت ساجدہ، پروفیسر حبیب الرحمٰن

مخدوم ادبی اوارڈ فنکشن میں ڈاکٹر زینت ساجدہ کی تقریر: دائیں سے بائیں: حافظ ابو یوسف، ایم. باگا ریڈی، اکبر علی خاں، ڈاکٹر چنا ریڈی، سردار جعفری

ڈاکٹر زینت ساجدہ کی باغ و بہار شخصیت، ان کی بذلہ سنجی اور ان کے مزاج کی ساری شگفتگی کا عکس ان کی تصانیف میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔ اپنی افتادِ طبع کے انسانوں سے لوگ بالعموم سنجیدہ موضوعات پر قلم اٹھانے کی توقع نہیں کرتے لیکن انھوں نے کلیاتِ شاہی اور تلنگو ادب کی تاریخ جیسی تصانیف پیش کر کے اپنی ادبی صلاحیتوں اور اپنی شخصیت کی ایک نئی جہت سے ہمیں روشناس کروا دیا ہے۔ میری دانست میں کلیاتِ شاہی ان کی سب سے اچھی تصنیف ہے یہ میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ میری نظر سے ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ نہیں گزرا ہے اور میں اس کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرنے سے قاصر ہوں۔ علی عادل شاہ ثانی بیجاپور کا ایک بلند پایہ شاعر اور ہر دلعزیز حکمران تھا جس کا زمانہ ۱۶۵۶ء سے شروع ہو کر ۱۶۷۲ء پر ختم ہوتا ہے جس طرح ایک کارگزار اور مستعد فرمانروا کی حیثیت سے علی عادل شاہ نے تاریخ بیجاپور پر اپنے عہدِ حکومت کے انمٹ نقش چھوڑے ہیں اسی طرح علوم و فنون کے سرپرست اور شعر و ادب کے قدردان کی حیثیت سے بھی اس کے کارنامے ناقابلِ فراموش ہیں۔ شاہی جیسے قادر الکلام اور بسیار گو شاعر، بیجاپور تو کیا پورے جنوبی ہند میں دو چار ہی نظر آتے ہیں۔ اس کے رنگا رنگ ادبی ذوق کا اس سے بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ

ڈاکٹر زینت ساجدہ کی تین تصانیف

ڈاکٹر سیدہ جعفر

اس نے تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کر کے اپنی استادی کا لوہا منوا لیا تھا اور "استادِ عالم" کے لقب سے مشہور ہوا تھا۔ غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، رباعی، گیت اور دوہا جیسی متنوع اصناف سے اس کے مختلف الجہت شعری مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ نے اس صاحب سیف و قلم کے حالاتِ زندگی اور اس کی فنی تخلیقات پر خوش اسلوبی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ علی عادل شاہ کی مہمات اور معرکہ آرائیوں کو تاریخی پس منظر میں پیش کر کے اس عہدِ رفتہ کی ایک واضح تصویر پیش کر دی ہے۔ اکثر تحقیقی موضوعات پر لکھی ہوئی کتابیں اپنے موضوع کی گمبھیر کیفیت اور اپنے براہِ راست اندازِ ترسیل کی وجہ سے عام قاری کے لئے دلچسپی کا زیادہ سامان فراہم نہیں کر سکتیں لیکن کلیاتِ شاہی کی مصنفہ نے اپنے اسلوب کی جاذبیت پر آنچ نہیں آنے دی ہے۔

کتاب کے آخر میں دکنی الفاظ کی فرہنگ موجود ہے اور سنسکرت کے تتسم اور تدبھو الفاظ کے مفاہیم کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ اس کے بعد "تشریحات" کے عنوان کے تحت بعض اساطیری کرداروں اور اصطلاحوں کی توضیح کی گئی ہے۔ کلیاتِ شاہی کا یہ حصہ بڑی محنت اور ریاضت سے مرتب کیا گیا ہے

* ہندو کلاسیکل ڈکشنری Myth and legends of india اور ابوریحان البیرونی کی کتاب الہند"

کی روشنی میں دیومالا سے متعلق اشاروں اور تلمیحات پر روشنی ڈالی گئی ہے تاکہ شاہی کے کلام سے قاری پوری طرح محظوظ و مستفید ہوسکے۔ بہمنی سلاطین اور ان کے بعد قطب شاہی اور عادل شاہی تاجداروں پر مقامی اثرات اور تہذیبی اقدار کا جادو چل گیا تھا اس لیئے پوری دکھنی شاعری پر ہندلمانی تہذیب کی چھاپ خاصی گہری نظر آتی ہے۔ علی عادل شاہ اسی گنگا جمنی تہذیب کا پروردہ تھا جو دو قوموں کی دوئی کا نہیں، ان کے باہمی اتصال اور ہم آمیزی کا نتیجہ تھا۔

علی عادل شاہ کے کلام کا تجزیہ کریں تو پتا چلتا ہے کہ اس تہذیبی فضا نے نہ صرف اس کے اندازِ فکر کو متاثر کیا تھا۔ بلکہ وہ اظہار و ابلاغ کے وسیلوں اور شعری سانچوں اور اس کی امیجری میں بھی سرایت کر گئی تھی اس لیئے کتاب کے آخر میں مصنفہ کی یہ تشریحات شاعر کے کلام کی تفہیم و تحسین میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ علی عادل شاہ کا ایک مشہور مخمس اکثر دکھنی محققین کی توجہ کا مرکز بنا رہا ہے اور اس کی اسناد کے بارے میں اختلافِ رائے کا اظہار کیا جاتا رہا ہے۔ کلیاتِ شاہی میں مصنفہ نے پورے اعتماد کے ساتھ اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے صحیح مخمس پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو یہ ہے ؎

پیو مورت دیکھوں سپنے میں
جب جاگوں تب رہوں تپنے میں
تن جالے جھک جھک جپنے میں
آرام اچھے مجھ کھپنے میں
کوئی جاؤ کہو مج ساجن سات ــــــ میں نیہہ بندی توں کیتا گھات

"تلاش کے محل" تلگو کی مشہور ناول نگار مہالی رنگنا یکما کے ناول کا ترجمہ ہے۔ ملک کے جذباتی اور تہذیبی اتحاد و یکجہتی کے لیئے یہ ضروری ہے کہ ہم دوسری زبانوں کی بہترین تخلیقات کے ذریعے سے ہندوستانی تہذیب کی اصل روح سے قریب ہوں اور اس مختلف اللسان اور بوقلموں تہذیبی کثرت میں وحدت کا جلوہ دیکھ سکیں۔ اس ناول میں تلگو ادیبہ نے موجودہ دور کی عورت کے ذہن، اس کے جذباتی مسائل اور پیچیدہ سماج میں اس کی بدلتی ہوئی حیثیت کو ایک نئے اور صداقت پسندانہ نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس ناول کی ہیروئن جھانوی ایک تعلیم یافتہ آزاد خیال اور روشن دماغ خاتون ہے اپنی ذہانت کے باوجود وہ بھی زندگی کی گتھیاں سلجھانے میں ناکام رہ جاتی ہے۔ اس کی روپوشی اور موت مرد کے حد سے بڑھتے ہوئے اور حاکمانہ ذہنیت کے خلاف ایک خاموش اور پراثر احتجاج ہے رنگنا یکما کا یہ ناول ان لوگوں کے لئے لمحۂ فکر پیدا کر دیتا ہے جو اپنی دانست میں یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستانی سماج میں اب طبقۂ اناث کو وہ آزادی اور وہ مقام حاصل ہو چکا ہے جس کا اسے صدیوں سے انتظار تھا۔ تلگو کے افسانوی ادب میں رنگنا یکما کی ادبی تخلیقات کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ان کے ناول "استری" اور ([illegible] House) طبع ہو کر تلگو دنیا سے خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ نے اس مشہور ناول نویس خاتون کی ایک مقبول خاص و عام تصنیف کا ترجمہ کر کے اسے اردو دنیا سے روشناس کروایا ہے ترجمے کی خوبی یہ ہے کہ اس پر اصل کا گمان گزرتا ہے۔ عبارتوں میں کہیں جھول نہیں۔ مکالموں کا انداز بے ساختہ اور فطری ہے اور پورا ناول بڑے سلیقے کے ساتھ منتقل کیا گیا ہے اس ناول کا مرکزی کردار جھانوی اپنے سارے شکستہ خوابوں، اپنی مجروح انا اور اپنی ہاری ہوئی بازی کے ساتھ ہمارے سامنے جلوہ گر ہو کر ہمارے شکستہ

ذہن پر ایک دیرپا نقش مرتسم کر دیتا ہے بعض نقادوں کا خیال ہے کہ ترجمے کا فن تخلیق سے زیادہ دقت طلب اور صبر آزما ہوتا ہے کیونکہ مترجم کو اپنے خیالات و تصورات کی ترجمانی اور اپنے مخصوص ابلاغ کو ترک کر کے مصنف کے ذہن سے سوچنا اور اس کے منفرد تخلیقی آہنگ کو اپنانا پڑتا ہے اس لیے ترجمے کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونا آسان کام نہیں ۔

ڈاکٹر زینت ساجدہ کی ایک اور ادبی کاوش " تلگو ادب کی تاریخ " ہے جو ڈی راما نجا راؤ اور ڈاکٹر صاحبہ کی مشترکہ سعی کا نتیجہ ہے ہندوستان میں اگرچہ زبان کی بنیاد پر ریاستوں کی تنظیم عمل میں آئی ہے لیکن آبادی کے اعتبار سے ہر ریاست میں ایسے افراد موجود ہیں جو ریاستی زبان میں ترسیل پر قادر نہیں ہیں ۔ ان کے لیے یہ مسئلہ دوسروں سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے کہ وہ اکثریت کی زبان سے واقفیت حاصل کریں تاکہ جذباتی ہم آہنگی اور موانست کی فضا پیدا ہو سکے ۔ اس مقصد کی تکمیل میں علاقائی زبانوں کے معیاری ادب کے ترجمے اور ادبی تاریخیں بھی ہماری مدد کر سکتی ہیں ۔ ادب خاموشی سے عصری حسیت کو بدلتا رہتا ہے ۔ اور اسی کے سہارے ہر دور میں انسان روایتی مسلمات پر سوالیہ نشان لگاتا رہتا ہے اور اسی سے صالح فکر کے سوتے پھوٹتے رہتے ہیں کسی مخصوص زبان کے بولنے والے اگر اپنے لسانی خول میں بند رہیں اور دوسری زبانوں کی نئی تحریکات اور حیات پر ور تصورات سے بے اعتنائی برتیں تو وہ عصری آگہی ، تہذیب کے رنگا رنگ جلووں ، اس کے گوناگوں مسائل اور اس کی حقیقی عظمت سے ناآشنا رہیں گے ۔ جس طرح مراٹھی میں دلت ادب ، بنگلہ اور ہندی میں ' بھوکی پیڑی کا ادب " نے موجودہ سماج اور اس کی الجھنوں کی سچی ترجمانی کی ہے اسی طرح تلگو میں " دگمبر ادب " نے گذشتہ چند سالوں میں ہمارے طرز فکر اور انداز نظر میں ایک انقلاب برپا کر دیا ہے زیر نظر تصنیف میں اس تحریک کا ذکر نہیں کیوں کہ یہ کتاب ۱۹۶۰ء میں مرتب ہو کر شائع ہوئی ہے ۔ اس میں ابتدا سے لے کر بیسویں صدی کی درمیانی دہائیوں تک کے تلگو ادب کا جائزہ لیا گیا ہے ۔ اور مختلف اصناف ادب کی نشوونما پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ ابتداء میں تاریخی اور تہذیبی پس منظر پیش کر کے تلگو ادب کے آغاز کو مفصل طور پر بیان کیا گیا ہے پر الک نیگ اور کاکتیہ عہد کے قدیم شعراء اور ان کی یادگار تخلیقات کو متعارف کروایا گیا ہے ۔ سلاطین گولکنڈہ بڑے کشادہ قلب اور وسیع النظر حکمران تھے انھوں نے جہاں دکھنی ادب کی ترویج و اشاعت سے دلچسپی لی ۔ وہیں تلگو ادب کی بھی سرپرستی کر کے اسے پھلنے پھولنے کے مواقع فراہم کیے ۔ دور ابراہیم قطب شاہ میں گنگا دھر کوی اور ردرا کوی ' محمد قلی کے دور میں سارنگ تمیا اور ملا ریڈی اور ابوالحسن تاناشاہ کے عہد میں گوپنا جیسی معروف ادبی ہستیاں گزری ہیں ۔ اس کتاب کے پہلے حصے میں تاریخی ترتیب کے ساتھ شعراء اور ادیبوں کے حالات زندگی اور ادبی اکتسابات کا جائزہ لیا گیا ہے اور دور جدید کے قلم کاروں کا ذکر اصناف سخن کے لحاظ سے کتاب کی زینت بنا ہے ۔ شاعری ، تحقیق و تنقید ، ڈراما ، افسانہ اور ناول کی اصناف میں جن شخصیتوں نے اپنی فنی یادگاریں چھوڑی ہیں ان کی حیات اور ادبی اکتسابات کے اہم خد و خال اور اسلوب بیان پر مختصر مگر جامع تبصرہ موجود ہے ۔ تلگو ادب کے عہد بہ عہد ترقی اور نشوونما کو سمجھنے میں یہ کتاب ہماری اچھی رہبری کرتی ہے ۔

بقیہ سلسلہ " ڈاکٹر زینت ساجدہ اور ان کے افسانے " ۔ ۔

یہ میری تمنا ہے کہ وہ اپنے افسانوں کی دنیا کی طرف لوٹ آئیں ۔ افسانہ نگاری کو اپنا وسیلۂ اظہار بنالیں اور اردو افسانے کے فروغ میں ایک یادگار تاریخی رول ادا کریں ۔ فن افسانہ نگاری کو واقعی ان کی ضرورت ہے ▼▲

نذرِ زینت ساجدہ

سید مظفر الدین خاں صاحب
حیدرآبادی

(بتقریبِ جشنِ اعترافِ خدمات منعقدہ ۲۷ جون ۱۹۸۱ء)

قطعۂ تاریخ

ہے چمن میں غنچۂ نو کی بہار — زینتِ باغِ دبستانِ کہن
طوطیٔ ملکِ دکن کہئیے انھیں — ہے بجا کہئیے اگر فخرِ وطن
گفتگو صد رشکِ عطرِ عنبریں — نطق اشکِ نافۂ مشکِ ختن
جو سخن مشقِ مسیحائی کرے — ہے اسی کا نام معراجِ سخن
ایک سورج نازشِ ہفت آسماں — ایک جلوہ زینتِ صد انجمن
ہوشمندی کا دیا ہم نے ثبوت — کرکے ان کا اعترافِ فکروفن

کہہ دو صاحب مصرعۂ تاریخ ساز
جشنِ زینت ساجدہ شمسِ زمن

۱۳۹۰ ف

رباعیات

(۱)

معمار کے تیشے سے ہے تعمیر کا نام
اعجازِ مسیحا سے ہے تاثیر کا نام
اک بات میں روشن کئے کتنے گوشے
وابستہ ترے دم سے ہے تقریر کا نام

(۲)

پھولوں سے پٹا پڑا ہے تیرا گلشن
گویا کہ ہے یہ اس کی دلیلِ روشن
اے جانِ تکلم تری اس دین کی خیر
بھرتے ہی چلے جاتے ہیں سب کے دامن

(۳)

بیشک ہے بیساختہ پن کی دولت
سو جان سے قربان ہے من کی دولت
ہے ان کا سخن زینتِ گوشِ دوراں
لٹتی ہے یہاں کام و دہن کی دولت

غالب تھے کبھی بزمِ سخن کی زینت
ہر جوہرِ قابل ہے وطن کی زینت
سچ ہے کہ شہنشاہِ خطابت کے بعد
زینت ہی بنی ملکِ دکن کی زینت

کسی بڑے آدمی صاحب سے جب پوچھا گیا کہ اُسے عورت کی کون سی بات پسند ہے، تو اُس نے بے ساختہ جواب دیا تھا۔ "کمزوری" یہ اکیسویں صدی کی کوئی تیری جو تھی دہائی کا زمانہ تھا۔ مگر آج جب لڑکیاں مردانی باس، پتلون، بشرٹ زیب تن کئے ہوئے "بیساکیا ہوں" بنا کیا تھا، کہتی ہیں تو کچھ لوگوں کو بھلے ہی محسوس ہو کہ کسی نے سینے میں زور کا گھونسا رسید کر دیا ہو لیکن بہتوں کو یہ بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اور ویسے بھی یہ "یونی سیکس" کا زمانہ ہے۔

مشرقی جرمنی کے ایک دوست نے مجھے یہ لطیفہ سُنایا تھا۔

"دو شخص ساتھ ساتھ راستہ چل رہے تھے، اور ان کے آگے آگے دو نوجوان جا رہے تھے۔ ایک نے اپنے برابر والے سے کہا دیکھئے تو یہ سامنے دائیں جانب جو نوجوان ہے کتنا بھلا لگتا ہے۔" دوسرے شخص نے جواب دیا۔ جناب وہ لڑکا نہیں ہے میری لڑکی ہے۔" تب پہلے شخص نے کہا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ آپ اس کی والدہ ہیں۔" پھر اس شخص نے جواب دیا۔ "جی آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، میں اس کی ماں نہیں، اس کا باپ ہوں۔"

آج مرد اور عورت کا فرق مٹتا جا رہا ہے۔ وہ زمانے لد گئے جب عورت اپنے مرد کے پیچھے، سر جھکائے آہستہ آہستہ چلا

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

بھرے گھر کی بہو

کرتی تھی۔ آج تو وہ مرد کے دوش بدوش ہی نہیں بلکہ مرد کے آگے چلنے والی حقیقت ہو گئی ہے۔

ایسی ہی ایک "رہنمائے مرد خاتون" کا آپ جشن منانے یہاں جمع ہوئے ہیں۔

زینت ساجدہ ہیں تو کرناٹک کی۔ ناگپور میں پیدا ہوئیں لیکن ان کا خاندان حیدرآباد کیا آیا "گنڈی پیٹ کا پانی" راس آگیا۔ اور یہیں کا ہو رہا۔

آپ زینت سے ملیے تو یہ پتا ہی نہیں چلے گا کہ یہ کوئی پڑھی لکھی خاتون ہیں۔ بس ایک عورت ہیں، مگر مصیبت یہ ہے کہ یہ نہ صرف خود پڑھی لکھی ہیں بلکہ دوسروں کو پڑھاتی بھی ہیں اور شاگرد وں کے تیار کرنے کے معاملے میں کسی منصوبہ بندی کی قائل نہیں۔ بے شمار شاگردوں کو انھوں نے شہر بھر ہی میں نہیں ریاست کے مختلف حصوں میں اور ملک کے مختلف شہروں میں بلکہ بیرون ملک بھی پھیلا رکھا ہے۔ ان ہی میں سے کچھ نے مل کر اور کچھ نے مجھ جیسوں کو پھانس کر جشنِ زینت ساجدہ کی محفل سجا رکھی ہے۔

آپ کو زینت پر مضمون لکھنا ہوگا۔ رشید موسوی کا خط آیا۔ پھر اوروں نے فون کئے۔ اور تو اور خود میرے گھر میں میری بیوی کا زینت کی اتنی گرویدہ ہے کہ وہ میرے سر ہو گئی تقاضا تو کسی ساہوکار نے بھی اتنا نہیں کیا ہوگا۔ مضمون لکھ لیا کہ نہیں ـــ اب کب لکھو گے۔ اور جولائی آ ہی گئی۔

لیکن زینت پر مضمون کہاں سے شروع کروں ؟ خود زینت کہاں سے شروع ہوتی ہے ؟
زینت کے شاگرد کہیں گے۔ ہم سے شروع کرو، وہ ہماری استاد رہی ہیں۔ ہماری تعمیر میں ان کا ہاتھ ہے۔
زینت کے بچے کہیں گے ہم سے شروع کرو، وہ ہماری چہیتی ماں ہیں "
جن کو زینت کی شاگردی کا یا یوں کہیئے کسی کی شاگردی کا شرف حاصل نہیں رہا لیکن جنھوں نے اردو ہال میں زینت کو تقریر کرتے سنا ہے۔ وہ کہیں گے بس یہیں سے شروع کیجیئے۔ زینت بہت اچھی تقریر کرتی ہے۔

کچھ ایسے بھی ہیں جو زینت سے خفا ہیں۔ انھیں انجھے سے بیر ہے ہیں۔ وہ کہیں گے۔ "مضمون یہیں سے شروع ہو۔ زینت بڑی گھمنڈی سی ہے، کسی کو خاطر میں نہیں لاتی۔ نہ اوپر والوں کی چاپلوسی کرتی ہے اور نہ نیچے والوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرتی ہے "۔ یہی عنصر انسانیت کا طرۂ امتیاز ہے اور یہ ایسے بڑے آدمی کی نشانی ہے جو بڑوں اور چھوٹوں کے بیچ میں ہوا کرتا ہے۔

کوئی کہے " زینت بڑی دین دار، مذہبی بلکہ مولوی قسم کی عورت ہے لیکن کوئی اور کہے گا : جی نہیں! بڑی بے باک اور جھگڑالو ہے۔ بھری محفل میں کچھ بھی کہہ دے گی اور اچھے اچھوں کے دل توڑ دے گی۔ رکھ رکھاؤ کی ایسے صاف ستھری زبان میں "مکاری" اور نستعلیق زبان میں مصلحت کہا جاتا ہے۔ زینت قائل نہیں ہے اور یہی اس کی کمزوری ہے جس کی وجہ سے اگر کچھ لوگ اس سے ناراض ہیں تو اکثر لوگ اسی بنا پر اسے ٹوٹ کر چاہتے ہیں۔

زینت چاہے بہت کچھ ہو، لیکن میں اسے بنیادی طور پر ٹیچر اور مدرس سمجھتا ہوں۔ اس کو تدریس سے عشق اور ٹیچری کی عادت پڑی ہوئی ہے۔ کسی شاعر نے اپنے کلام کا مجموعہ دیا۔ پڑھتی ہے تو ہاتھ میں پنسل ہوگی۔ یہاں مصرعہ وزن سے گرتا ہے یہ لفظ بحر سے خارج ہے یہ شعر غزل کی مجموعی فضا سے ہم آہنگ نہیں۔ یہاں ایطا ہے۔ یہاں یہ لفظ نہ ہو اور اس کے بجائے دوسرا لفظ ہو تو شعر اور بھی حسین ہو جائے گا۔ غرض مجموعۂ کلام کا قیمہ بن جائے گا۔

ایک روز دیکھیئے نا! میرے گھر آگئیں اور میری میز پر سے وہ خط اٹھا لیا جو میں نے اپنی بیوی کو لکھا تھا۔ پہلے تو دوسروں کا خط پڑھنا ہی معیوب بات ہے۔ پھر آپ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگیں : "یہ خط تمہارا ہے ؟ اتنی غلطیاں ؟ یہاں املا غلط ہے یہاں جملے کی نزاکت الگ نرم ؟ وازو والا لفظ چاہتی ہے، یہ ثقیل لفظ گراں گذرتا ہے۔ پھر تم نے "نے" کا استعمال کیوں نہیں کیا ؟" میں نے جواب دیا : " جناب میں نے اپنی بیوی کو خط لکھا ہے، کسی زبان دانی کے امتحان کا پرچہ نہیں لکھا ہے اب آپ سے کیا چھپاؤں ؟ میں نے مخمور جالندھری کا ایک مضمون پڑھا تھا۔ "نے" کا اس کثرت سے اور اس قدر بے جا استعمال کیا تھا کہ مجھے اس لفظ سے "الرجک" ہو گئی۔ اسی موڈ میں اپنی بیوی کو خط لکھا تھا۔ جس میں "نے" کا لفظ سرے سے غائب تھا۔ زینت نے بس اسی کو پکڑ لیا۔ در ورغ برگردن راوی، جن لوگوں نے سنا ہے انھوں نے مجھ سے کہا ہے کہ زینت اور شاہد کی "لڑائی" دیکھنے لائق ہوتی ہے۔ زینت بالکل مدرسانہ شان سے شاہد سے مخاطب ہوتی ہیں "بالو"! تم یہ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے ؟" محسوس ہوتا ہے کہ بیوی، شوہر کا جھگڑا نہیں ہے، بلکہ درس و تدریس کا عمل جاری ہے

زینت کا شمار میں ہندوستان کی ان گنی چنی لکھنے والی عورتوں میں کرتا ہوں جن کا بے باکی میں جواب نہیں اور جن کے ...

سے اچھے: چھوٹوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔ امرتا پریتم، عصمت چغتائی، عطیاؔ رنگ تکیا اور زینت ساجدہ ان میں سرفہرست ہیں
دہلی میں انجمن ترقی اردو کے دفتر اردو گھر میں کوئی ادبی محفل تھی۔ آہستہ آہستہ ساری عورتیں چلی گئیں۔ تب میں
نے عصمت سے کہا: "آپا! اب محفل میں آپ ایک ہی خاتون رہ گئی ہیں۔" عصمت آپا نے فوراً ہی جڑ دیا: "آپ کیوں
احساس کمتری سے بیچارے ہیں" یہ دو تو کھل کھلا کر ہنس دیں۔ لیکن میں بڑی مشکل سے اپنے آنسو ضبط کر سکا۔

زینت باتوں ہی باتوں میں مخاطب کا کارٹون بنا دے گی۔ کارٹون کے فن کی خوبی ہی یہ ہے کہ فن کار اپنے موضوع
کے سب سے کمزور پہلو کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور یہی کارٹون کی جان ہوتی ہے۔ دیکھنے والے خوش ہوتے ہیں اور جس
کا کارٹون ہوتا ہے اس کا حال دوسرا ہی ہوتا ہے۔ اس مقام پر بھی زینت ایک بڑی آرٹسٹ ہے۔

وہ مومن کا زمانہ تھا کہ مومن اپنے صنم آشنا دل سے دعا مانگتے تھے لیکن اپنی غرض کی تکمیل کے لئے۔ اس دعا کا الٹا
ہی اثر ہوتا تھا۔ مومن کو شکایت ہوتی ہے۔ آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ۔ زینت کا دل بھی صنم آشنا ہے۔
مگر وہ سر بسجود جب دعا مانگتی ہے تو اپنے صنم کی صحت اور درازیٔ عمر کے لئے۔ ابھی حال ہی کی بات ہے کہ شاہد صاحب بیمار تھے۔
زینت نے اللہ میاں سے دعا مانگی کہ شاہد کی صحت بحال ہو جائے۔ مگر اللہ میاں بھی سپریم کورٹ کی رولنگ کے شاید پابند تھے
انہوں نے دعا کی درخواست لے لی اور اس پر "تحت التوا" حالت جوں کی توں رہے کا اسٹے آرڈر دے دیا اور نتیجہ یہ ہوا
کہ مرض جوں کا توں باقی رہا۔ پھر ہم نے کہا ہمارا ٹریڈ یونین اصول تو یہ ہے کہ نمائندگی REPRESENTATION اور جد و جہد
اور AGITATION ساتھ ساتھ چلیں تو کچھ بات بنتی ہے۔ چنانچہ زینت کی دعاؤں کے ساتھ ساتھ قرآن اور رامائن
کی دوائیں بھی جب جوڑ دی گئیں تو شاہد اٹھ کھڑے ہوئے۔

حیدرآباد کے نثر نگاروں کی جب پہلی جلد شائع ہوئی جو زینت ہی کی مرتب ہے تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے آل احمد سرور نے کہا تھا
کہ زینت ساجدہ کا افسانہ 'اوتار' شامل انتخاب ہے۔ وہ اچھے انشائیے لکھتی ہیں۔ کسی انشائیے کا انتخاب ان کی بہتر نمائندگی کر سکتا تھا
تو میں نے سب رسالے اور سیاست کے شمارے چھان ڈالے اور 'اللہ میاں عورت ہوتے' سے 'کاش میں مرد ہوتی' تک جتنے انشائیے تھے
پڑھ ڈالے۔ ان میں سے اکثر بیشتر انشائیوں کا مرکزی کردار عورت ہے اور وہ بھی کون عورت؟ ایک متوسط مشترک گھرانے کی پڑھی
لکھی سگھڑ عورت، زینت کی ہیروئین ہے۔ وہ ماں ہے، بیوی ہے، بہن ہے، بیٹی ہے، بھرے گھر کی بہو ہے، سلیقہ مند ہے
ملازمت کرتی اور کماتی بھی ہے اور گھر کے کاروبار سے بھی علاقہ رکھتی ہے۔

زینت کو خلش ہے کہ اللہ میاں میں ستر ماؤں کی ممتا ہے لیکن وہ عورت نہیں۔ اور مردوں نے انہیں مذکر بنا رکھا ہے لیکن
زینت نے یہ نہیں سوچا کہ اللہ میاں معشوقِ حقیقی ہیں اور اردو شاعری نے فارسی شاعری کے تتبع میں معشوق کو ہمیشہ مذکر گردانا
ہے۔ ہلی کی چھاؤں پڑتی تو صیغہ مونث ہوتا اور ہندی کا اثر ہوتا تو ہم خود جامۂ نسوانیت پہن لیتے اور خدا پھر بھی مذکر ہی ہوتا۔

"اگر میں مرد ہوتی" میں زینت نے مردوں کی ان کمزوریوں کو خوب اچھالا ہے جو عام طور سے عورتوں کو بہت مرغوب ہیں
لیکن مجھ سے پوچھئے کہ زینت مرد ہوتی تو کیا ہوتا؟ میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ زینت ایک درازریش مولوی ہوتی اور مجھ
جیسے بچوں کو پڑھاتی ہوتی۔

قصہ مختصر زینت کی عورت ایک جبری دور کی عورت ہے وہ قدیم جاگیردارانہ ماحول کی گھٹن سے نکل چکی ہے۔ اب وہ

بقیہ صفحہ ۱۰۴ پر

سعید شہیدی

بھائی کا ہدیۂ خلوص بہن کی خدمت میں

(ڈاکٹر زینت ساجدہ کے جلسۂ تہنیت کے موقع پر)

باعثِ افتخارِ وطن ذات سے اپنی اک انجمن

یہ ادیبہ ہے نقّاد ہے جانتے ہیں یہ اربابِ فن

وہ روانی ہے تقریر میں جیسے جنّت میں نہرِ لبن

ہے کبھی تو یہ شعلہ فشاں اور کبھی ہے یہ شیریں سخن

رنگ لاکر ہی آخر رہا درس و تدریس کا بانکپن

اس کا اعزاز ان کو ملا شاد ہیں سارے اہلِ دکن

صدق دل سے دُعا ہے سعیدؔ ان کے حامی رہیں پنجتن

شاد و خرّم رہے یہ سدا ہے سر سبز اس کا چمن

خواجہ عبدالغفور
(آئی. اے. ایس)

"ارم منزل" کالونی کہسار میں رہنے والی زینت النساء ساجدہ بھی ہیں اور عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی صدر بھی۔ اس اعزاز کی وہ مستحق تو ہیں ہی لیکن شاگرد رشید کی حیثیت سے یہ ورثہ ان کو ڈاکٹر مولوی عبدالحق۔ محی الدین قادری زورؔ اور عبدالقادر سروری اور اسی درجہ کے عالی مقام دانشور اساتذہ سے ملا ہے۔

تعلیم کے اعلیٰ مدارج طے کرنے سے بہت پہلے ہی ان کی تصانیف اور تالیفات کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ چنانچہ تلگو ادب کی تاریخ۔ کلیات شاہی۔ جلترنگ علی عادل شاہ ثانی۔ حیدرآباد کے ادیب' ناش کے محل (تلگو ناول کا ترجمہ) حکمراں خواتین، محب وطن خواتین اور بچوں کے ادب میں۔ نگر نگر کی بات۔ وغیرہ اعلیٰ ادبی تحقیقاتی تاریخی تخلیقات ہیں جو آج بھی اردو ادب میں تازہ ہیں اور اپنا مقام رکھتی ہیں۔

ویسے ان کی پہلی قابل قدر تخلیق افسانہ نما مضمون 'لاٹری' ہے جس کو ماہنامہ شہاب کے مدیر سنبل صاحب نے بڑی تعریف و توصیف کے ساتھ شائع کیا تھا۔

زیر طبع تصانیف میں طنزیہ ادب بھی شریک ہے۔ زینت ساجدہ ایک تازہ دم تخلیق کار ہیں یہ زندگی کو ادب میں ڈھالتی ہیں اور ادب کو زندگی کا ماحصل سمجھتی ہیں۔ یہ معاشرہ اور سماج کے تانے بانے کو برقرار رکھ کر ہی پرکلکاریاں کرتی ہیں۔ ان کے افسانوں کے پس منظر میں حقیقت کی جھلکیاں ہوتی ہیں جو ان کے مشاہدہ اور بصیرت کی گہرائی وگیرائی لیے ہوتا ہے۔

زینت ساجدہ کا قلم ان کی سوجھ بوجھ کا آئینہ دار ہوتا ہے اور ان کا تجزیہ اور تفکر فرد اور سماج سے کبھی بے نیاز نہیں۔ بقول خود ان کی ہر تخلیق کا پس منظر حقیقت پر مبنی ہے اور ان کا ادبی نظریہ ترقی پسند ہے لیکن ان کا اسلوب اور افسانہ کی تکنیک تجریدی اور بھیانک نہیں کہ جہاں انسان کے بجائے چہرے اور اس کے جسم کی جگہ لاش اور زندگی کی بجائے

روانی آگ کا دریا ہوتی ہے متحرک زندہ انسانوں کے بجائے قبرستان اور شمشان ہوتے ہیں۔ ہر جگہ ہر موڑ پہ تجربہ کی رمز ابہام اور بھول بھلیوں میں خیال کے تسلسل کو گمراہ کر دیتی ہے۔ جدت و ندرت انفرادیت اور امتیاز کی خاطر سے آج کا افسانہ نگار علامتوں اشاروں کنایوں سے وہ سب کچھ کہنا چاہتا ہے کہ جو اس کے لاشعور میں ہے مگر اپنے قاری کو وہ ساتھ نہیں لے چلتا کہ خود اس کی راہ متعین نہیں اس کی عکاسی ایکس رے کی طرف مائل رہتی ہے یا پھر UNDER EXPOSED ہو کر رہ جاتی ہے۔

زینت ساجدہ ترقی پسند ضرور ہیں لیکن یہ حقیقت پسند زیادہ ہیں اور ان کے افسانوں کا تناظر جیتے جاگتے۔ ہنستے ہنساتے۔ روتے رلاتے گوشت پوست کے انسانوں سے مزین ہے جن کا لاشعور انھیں کامیاب یا ناکام انسان بناتا ہے۔ ان کے افسانوں کی تکنیک کی منفرد اور بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ قاری کو بھی اپنے افسانہ کا شریک بنا لیتی ہے وہ محض تماشائی نہیں بلکہ اپنا مقام رکھتا ہے۔ افسانہ نگاری کی کامیابی کا دارومدار اس تکنیک پر ہے اور زینت ساجدہ اس تکنیک کی ماہر ہیں شاید اس حقیقت کا پرتو ہے کہ ان کا فن ان کی ذاتی شخصیت کے حُسن کا آئینہ دار ہے۔ زینت ساجدہ اعلیٰ درجہ کی مقرر بھی ہیں۔ پروفیسر کی حیثیت سے تقریر اور حسن بیان تو ان کی جبلت بن گئے ہیں لیکن خیالات کی اپج اور اظہار کی ندرت نے ان کے نطق کو چار چاند لگائے ہیں۔

عاتق شاہ

ایک آواز ایک تاثر

ایک آواز جو مسلسل تینتیس سال یونیورسٹی اور یونیورسٹی کے باہر گونج رہی ہے اور جسے لڑکے، لڑکیاں، بچے، بوڑھے اور جوان بڑے غور سے سنتے ہیں اور جو سب کے لئے قابل قبول ہے۔ ایک آواز جس نے شعر اور حکمت کی گتھیاں سلجھائیں اور جس نے درس و تدریس کے پیشے کی آبرو رکھ لی۔ ایک آواز جو معتبر ہے اور جس میں دو دھاری تلوار کی کاٹ بھی، ایک آواز جو بڑی دور اور قریب سے آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اور اس آواز کا نام ہے زینت ساجدہ ـــــ

لیکن زینت ساجدہ صرف ایک آواز کا نام نہیں ہے! زینت ساجدہ ایک بھرپور اور مکمل شخصیت کا نام ہے اور اس شخصیت کے اندر کئی زینت ساجدائیں سانس لے رہی ہیں۔ یہ سب آپس میں مشابہ ہوتی ہوئی بھی ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اور جن کا تقابل ممکن نہیں۔

پہلی ملاقات میں زینت، آپ سے اس طرح بات کریں گی جیسے وہ آپ کو برسوں سے جانتی ہیں۔ گفتگو اور لب و لہجہ بہت ہی نرم ہوگا۔ اور انداز پُر خلوص اور سرپرستانہ۔ آپ بڑے احترام اور سعادت مندی سے زینت کو سنیں گے اور جب لوٹیں گے تو آپ کو احساس ہوگا کہ آپ نے صرف اچھے سامع ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

زینت سنتی کم ہیں اور بولتی زیادہ ہیں۔

صبح سے شام تک وہ یونیورسٹی میں اپنی اس عادت کو پورا کرلیتی ہیں لیکن لمبی چھٹیوں پر جب یونیورسٹی بند ہوجاتی ہے تو زینت کی بےچینی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے کیوں کہ وہ گھر خاموش بیٹھ ہی نہیں سکتیں۔ ان دنوں شعر و ادب کے شیدائی دونوں شہروں میں ادبی جلسے اور مشاعرے منعقد کرواتے ہیں اور وہ تقریر کے لئے نکل پڑتی ہیں۔

ہر مداح اور جھک کر ملنے والے کو زینت اپنا شاگرد سمجھتی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہر شاگرد اور جھک کر ملنے والا مداح نہیں ہوتا۔
زینت کے مداحوں کی گنتی یقیناً مشکل ہے اس طرح شاگردوں کی بھی جو ملک اور بیرون ملک کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں پھیلے

ہوئے ہیں۔ آپ چاہیں تو اس لمبی فہرست میں میرا نام بھی لکھ سکتے ہیں۔

جی ہاں! میں بھی زینت کا شاگرد رہا ہوں!

لیکن اس میں حیرت کی کیا بات ہے! اگر کوئی وقت پر پڑھے لکھے نہیں اور اپنی عمر عزیز کا بہترین اور قیمتی وقت آوارہ گردی میں یا سونے میں گزار دے تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔ اور اگر کسی کو بعد میں ہوش آئے اور اپنے نقصان کی تلافی کے لئے پھر تعلیم کی طرف متوجہ ہو تو اس کا وہی حشر ہوتا ہے جو میرا ہوا۔ یعنی دوست، استاد بن جاتے ہیں اور چھوٹے مشورے دینے لگتے ہیں۔ یہ مقام عبرت ہے۔ خدا ایسا دن کسی کو نہ دکھائے۔ شاعر نے اسی دن کے لئے کیا خوب کہا ہے۔ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو!

دوسروں کے لئے سامانِ عبرت فراہم کرنے والا خود کیا عبرت حاصل کر سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے ایم اے میں داخلہ لیا۔ اور اپنے کم عمر ساتھی نوجوان لڑکوں، اور لڑکیوں کے ساتھ کلاس میں جا بیٹھا۔ میری اس حرکت پر کتنے ہنسے اور کتنے زیرِ لب مسکرائے، میں نہیں جانتا البتہ مجھے ان پر ضرور ہنسی آتی تھی جو مجھے غور سے دیکھتے تھے بلکہ سچ پوچھئے تو میں ان پر ہنستا تھا۔ بے عزتی کی بھی حد ہوتی ہے۔ اب آپ سے کیا عرض کروں۔ میں بڑی سپاہیانہ شان سے کلاس روم میں داخل ہوتا اور چاروں طرف مسکراہٹ کی ایک لہر دوڑ جاتی!

میرے بجائے اگر کوئی اور ہوتا تو شرم سے پانی پانی ہو جاتا۔ لیکن میں نہیں شرمایا البتہ مجھے دیکھ کر زینت شرما گئیں!

یہ زینت کی پہلی کلاس تھی۔ ہم سب طالب علم زینت کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ رُک گئیں۔ دوسرے طالب علم کلاس روم میں داخل ہو گئے زینت نے اشارے سے مجھے رُکنے کے لئے کہا، اور بولیں: "میں تمہیں کیا پڑھاؤں گی؟"

پھر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا، آئندہ سے میری کلاس میں آنے کی ضرورت نہیں میں تمہیں حاضری دیتی رہوں گی! جاؤ گھر جاؤ ____"

زینت ساجدہ کی اور میری افسانہ نگاری کی عمر قریب قریب ایک ہے۔ فرق اتنا ہے کہ زینت کا افسانوی مجموعہ "جل ترنگ" ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا اور مجموعہ "نٹ پاتھ کی شہزادی" مئی ۱۹۴۸ء کو چھپا۔ اس وقت میرے علاوہ زینت کے ساتھی افسانہ نگاروں میں ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، عزیز النساء حبیبی، سعیدہ مظہر، لو شابہ خاتون، محبوب حسین جگر، سردار سلیم، شفقت رضوی اور ظفر عالم گر قابلِ ذکر ہیں۔

ابراہیم جلیس بہت پہلے سے لکھ رہے تھے اور ان کے دو مجموعے "زرد چہرے" اور "چالیس کروڑ بھکاری" شائع ہو کر مقبول ہو چکے تھے۔ بہرحال حیدرآباد میں افسانہ نگاروں کا ایک قابلِ لحاظ گروہ تھا جو ملک کے دوسرے افسانہ نگاروں کے شانہ آزادی کی لڑائی میں برابر کا شریک تھا۔ یہاں کے تمام افسانہ نگار متوسط اور نچلے متوسط طبقے کی زندگی کو پیش کر رہے تھے زینت بھی ان میں سے ایک تھیں!

لیکن ایک ہونے کے باوجود ان سب سے مختلف تھیں، الگ تھیں۔ زینت نے صرف دو تین کہانیاں لکھ کر ہی ادبی حلقوں کو چونکا دیا تھا اور اردو کا ایک عام قاری یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ یہ وہی آواز ہے جو اس کے گھر کی چار دیواری میں بند اس کی بیوی، بیٹی، بہن اور محبوبہ کی روح کے کسی گوشے میں صدیوں سے دبی پڑی ہے اور جس نے اظہار کے لئے زینت کو اپنا وسیلہ بنایا!

زینت کہانی سنانا جانتی ہیں!

کیوں کہ کہانی زینت کے خون میں شامل ہے۔ اس لئے وہ جب عام قسم کی بات بھی کرتی ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کہانی سنا رہی ہیں یا سُنانے والی ہیں۔

زینت اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی تھیں۔ کوئی مانے یا نہ مانے کم از کم مجھے اس کا اعتراف ضرور کرنا چاہیئے۔ میں زینت سے خائف تھا خائف کیا میں زینت سے جلتا تھا اور سوچتا تھا کہ یہ محترمہ ہانڈی چولہا چھوڑ کر کیوں افسانہ نگاری کے میدان میں اُتر آئی ہیں؟ عورت کا صحیح مقام تو اس کا گھر ہے اور اس کا آرٹ تو اچھی دال بگھارنے میں پوشیدہ ہے۔ اکبر الٰہ آبادی نے سچ ہی کہا تھا ______

رقابت وہیں ہوتی ہے جہاں آدمی مقابلے کا ہو ورنہ کمتر سے ڈر کیسا؟

"جل ترنگ" کی اشاعت کے بعد غیر محسوس طور پر زینت افسانہ نگاری کے میدان سے دور ہوتی گئیں اور پھر ایک موڑ ایسا بھی آیا کہ وہ صرف نام کی افسانہ نگار باقی رہ گئیں لیکن اس سے ہٹ کر وہ سب کچھ تھیں ______

ایک اچھی مقرر اور نقاد کی حیثیت سے زینت کی صلاحیتوں سے کون انکار کر سکتا ہے؟

لیکن ہوا یوں کہ زینت ہر مرض کی دوا سمجھی جانے لگیں۔ چنانچہ ادبی جلسوں کی صدارت سے لے کر مشاعروں کی کمنٹری تک زینت کی ذمہ داری سمجھی جانے لگی ____ اب حد یہ ہوگئی کہ زینت کو مہمان خصوصی بنا کر دو تین گھنٹوں کیلئے بٹھا دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ خاموش رہیئے کیوں کہ آپ مہمان خصوصی ہیں۔ اور اچھا مہمان خصوصی وہی ہوتا ہے جو جلسے کے اختتام تک مسکراتا رہے۔ میں نہیں جانتا کہ یہ بات زینت کے لئے اعزاز ہے یا سزا!

یہی نہیں بلکہ شعری اور افسانوی مجموعوں کی رسم اجراء میں بھی زینت کی موجودگی ضروری سمجھی جانے لگی ہر شاعر اور ادیب دوڑا دوڑا زینت کے یہاں پہونچ رہا ہے کہ ہمارے مجموعے پر ایک مقدمہ لکھ دیجئے یا نہیں تو مختصر آرائے لکھ دیجئے۔ بگڑ لکھیئے ضرور اور زینت کا یہ حال کہ اخلاق اور مروت میں انکار ہی نہیں کر پاتیں اگر معذرت کی نوبت بھی آئے تو یہاں زینت کی سُننے والا کون ہے۔ لہٰذا زینت کو کچھ نہ کچھ لکھنا ہی پڑتا ہے اور اب تو "مقدمہ بازی" میں زینت اتنی اکسپرٹ ہوگئی ہیں کہ بغیر کتاب پڑھے لکھ دیتی ہیں اور اس خوبی اور نفاست سے لکھتی ہیں کہ پبلک بھی خوش اور صاحب کتاب بھی ____

چنانچہ میرے ایک شاعر دوست بھی خوش تھے کہ ان کے پہلے شعری مجموعے پہ زینت نے بہت ہی عمدہ مقدمہ لکھا ہے۔ کئی بار اُنہوں نے اپنی مسرت کا اظہار کیا اور مجھ سے میری رائے پوچھتے رہے۔ میں ہمیشہ مسکرا کر ٹالتا رہا لیکن جب وہ مصر ہوگئے تو میں نے کہا زینت نے تمہاری شاعری اور فن کے بارے میں ایک فقرہ بھی نہیں لکھا۔ بڑی خوبی سے تمہیں ٹال گئیں اور خود کو یہ کہہ کر بچا لیا کہ میں دوستوں کے عیوب پر نظر نہیں ڈالتی ورنہ تمہاری خیر نہ تھی۔ باقی جو بھی لکھا اس میں تمہاری شخصی نالائقیوں کا ذکر ہے اور اس میں یہ بتایا ہے کہ تم نے اپنا سفر عابد روڈ سے شروع کیا تھا اور معظم جاہی مارکٹ پہونچ کر ٹھہر گئے اور پینتیس سال سے اس کے اطراف گھوم رہے ہو۔ یہ کوئی تعریف نہیں بلکہ تمہیں آئینہ دکھایا گیا ہے کہ تم کہاں واقع ہو؟

میری اس سخت رائے پہ وہ برہم ضرور ہوئے لیکن زینت کی تعریف میں کمی نہیں ہونے دی۔ اور میں حیران سوچتا رہ گیا

کہ زینت کی تحریر کا آخر وہ کون سا جادو ہے جو انھیں اپنی گرفت سے آزاد نہ کرسکا۔

مخدوم محی الدین کے بعد زینت کی ہی وہ واحد شخصیت ہے جسے عوام اور خواص میں یکساں مقبولیت حاصل ہے زینت کے بغیر حیدرآباد کے کسی علمی، ادبی اور تہذیبی جلسے کا تصور ممکن نہیں۔ یہی نہیں بلکہ زینت شادی بیاہ کی تقاریب اور میت کے جلوس میں بھی اسی اہتمام کے ساتھ شریک ہوتی ہیں جیسے کسی ادبی جلسے میں۔ فرق اتنا ہے کہ وہ یہاں تقریر نہیں کرتیں بلکہ خاموش گواہ کی حیثیت میں سب کچھ دیکھتی رہتی ہیں۔ اسی لئے شدت سے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ زینت کے اندر چھپی ہوئی آرٹسٹ جاگ رہی ہے!

اسی ایک لمحہ میں مجھے ماضی کی ایک ایک بات یاد آگئی اور برسہا برس ذہن سے میری نظروں کے سامنے سے گزر گئے۔

زینت میرے سامنے کھڑی تھیں۔

میرے ہم جماعت کلاس روم میں جاچکے تھے اور میں زینت کی شرافت اور بڑائی کا قائل ہوگیا ورنہ چھوٹے لوگ تو ایسے لمحوں میں اچھل پڑتے ہیں۔

میں نے ہنس کر کہا "بھئی واہ! آپ کی کلاس کیوں چھوڑی جائے۔ جب طالب علم ہی نہیں ہیں تو اسے بھی اٹنڈ کریں گے"۔

چنانچہ زینت کے پیچھے پیچھے میں کلاس روم میں داخل ہوا ـــــ یہ ۱۹۶۳ء کی بات ہے۔

اس سال ایم اے ابتدائی میں بڑے جغادری قسم کے لوگوں نے داخلہ لیا تھا۔ آنے والے سال میں بھی یہی ہوا۔ میری جماعت میں کوئی تیرہ یا چودہ طالب علم تھے۔ چار کو چھوڑ کر باقی سب لڑکیاں تھیں۔ ان طالب علموں میں دو نام بڑے اہم تھے۔ ایک سید مصطفےٰ کمال اور دوسرا اشرف رفیع کا۔

اردو حلقوں میں اشرف رفیع ایک شاعرہ کی حیثیت سے اور مصطفےٰ کمال صحافی کی حیثیت سے مشہور ہوچکے تھے۔ جونیرس میں فارسی اور اردو کے مشہور شاعر قمر ساحری اور شفیق سنجر قابل ذکر ہیں نوجوان ادیب احمد جلیس اور "مخدوم ایک مطالعہ" کے مصنف داؤد اشرف اسی بیاچ میں شامل تھے۔ مختصر یہ کہ شعبہ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی ایک فوجی یونٹ کی طرح کام کر رہا تھا۔ اور بقول صدر شعبہ پروفیسر ڈاکٹر مسعود حسین خاں سارا اسٹاف الرٹ تھا۔

میں نے سوچا کہیں زینت میری اور مصطفےٰ کمال کی موجودگی سے نروس تو نہیں ہیں لیکن خود مجھے اپنی اس سوچ پر ہنسی آگئی کیوں کہ زینت اور نروس یہ دو متضاد لفظ ہیں۔ میں نے دیکھا ایک ثانیہ کے لئے زینت نے مسکراتے ہوئے مجھ پر نظر ڈالی اور دوسرے ثانیے وہ میرے وجود کو سرے سے بھلا کر اس طرح کلاس سے مخاطب ہوئیں جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ دنیا کا اور یونیورسٹی کا ہر کام برابر اور وقت پر ہو رہا ہے۔

زینت کی بات نہ مان کر میں نے کلاس اٹنڈ کی۔ اور یہ ٹھیک ہی کیا۔ ورنہ میں جس نئے اور اچھے تجربے سے آگاہ ہونے والا تھا اس سے محروم رہتا اور انجانے میں پتا ہی نہیں چلتا کہ میں نے کیا چیز کھودی ہے!

زینت ڈرامہ پڑھا رہی تھیں۔

اور میں حیران تھا کیوں کہ یہ وہ زینت نہیں تھیں جنھیں میں ترقی پسند مصنفین کے جلسوں سے لے کر عام ادبی جلسوں میں

سن چکا تھا۔ یہ ایک نئی زینت ساجدہ تھیں۔ خاموش سنجیدہ اور سو فیصد انٹلکچو ل۔

زینت اردو ڈرامے کا تاریخی پس منظر دیتی ہوئی اس کی ناکامی کے اسباب پر روشنی ڈال رہی تھیں اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ڈرامے پر لکھی ہوئی درجنوں کتابیں میرے سامنے کھلتی جارہی ہیں۔

مجھے یاد ہے ڈرامے کی ایک اور کلاس میں طلبہ کی اکثریت نے زینت سے ڈرامے پر چند نوٹس لکھوانے کی خواہش کی۔ پہلے تو زینت نے انکار کیا پھر راضی ہوگئیں اور کہا لکھئے۔

سب اپنی دانست میں یہ سمجھ رہے تھے کہ زینت کہیں نہ کہیں سے کوئی نوٹ بک برآمد کریں گی اور اسے کھول کر کسی نہ کسی صفحہ سے لکھوانا شروع کریں گی لیکن زینت نے ایسا نہیں کیا بلکہ شروع ہوگئیں اور مسلسل پچاس یا پچپن منٹ تک بولتی رہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے کوئی اچھا اسکالر کسی سیمنار میں پیپر پڑھتا ہے۔ ایک متوازن لب ولہجہ اور متوازن رفتار کے ساتھ۔

ڈرامے کے علاوہ زینت نے غالب بھی پڑھایا تھا اور ذاتی طور پر میں نے یہ تاثر قبول کیا تھا کہ یہ غالب بڑے کام کی چیز ہیں اور انھیں بار بار پڑھنا چاہیئے۔ اس تاثر کو میں ایک اچھے ٹیچر کی دین سمجھتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ زینت صرف ہماری یونیورسٹی کی نہیں بلکہ ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں میں اردو پڑھانے والے ان اچھے ٹیچروں میں سے ایک ہیں جنھوں نے طلبہ کو ایک تخلیقی فکر عطا کی۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ زینت لڑکوں میں زیادہ مقبول ہیں یا لڑکیوں میں۔ البتہ لڑکیاں زینت سے زیادہ متاثر معلوم ہوتی ہیں۔ ابھی حال حال میں میری ایک کزن کے گھر ان کی سہیلی سے ملاقات ہوئی جو دو بچوں کی ماں ہیں۔ تعارف ہوا۔ اور انہوں نے رسماً نہیں بلکہ عملاً خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا، "بھیا! ٹھہریئے میں آپ کے لئے چائے بنا کر لاتا ہوں"۔

میں نے مسکرا کر پوچھا، کہیں آپ زینت کی اسٹوڈنٹ تو نہیں؟

وہ فوراً اچھل کر پوچھیں "اللہ ۔ آپ نے کیسے پہچانا بھیا ۔۔۔!

میں تو اُن کا ہی اسٹوڈنٹ ہوں"۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا، بہت سیدھی اور آسان سی بات ہے اور یہ کہ لڑکی یا خاتون بات چیت میں صیغہ مذکر استعمال کرے وہ سوائے زینت کے اور کس کی اسٹوڈنٹ ہوسکتی ہے!

یہ مردانہ لب ولہجہ اصل میں ایک نفسیاتی ردعمل ہے سماج کے اس طبقے کے خلاف جس نے عورت کی آواز کو ہمیشہ دبائے رکھا۔ زینت کے الفاظ میں "ایک عورت اور اس کے ساتھ ہزار جنجال ۔۔ بال سے باریک اور تلوار سے تیز راستے پر سنبھل سنبھل کر چلنا ہی اس کا سب سے بڑا کمال ہے۔ اور یہ عورت اور صرف عورت ہی کرسکتی ہے۔ اس لئے اگر کوئی کہے کہ عورت کسی فن میں کامل نہیں ہوسکتی تو اس کا منہ نوچ لیجئے اور کہیئے کہ ایک کمرہ اور فرصت کا ایک دن تو فراہم کر دے؟" (ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور زینت ساجدہ کا ایک انشائیہ)

کیا کوئی مائی کا لال عورت کی اس مشکل کو حل کرسکتا ہے!

سب ہی جانتے ہیں کہ زینت متوسط گھرانے میں پیدا ہوئیں اور اپنے گھر کی سب سے بڑی لڑکی ہیں، لیکن ایک لڑکا بن کر

انہوں نے اپنے چھوٹے بھائیوں اور بہنوں کو پڑھایا، لکھایا اور انھیں سماج میں ایک باعزت مقام دلایا۔ زینت کی زندگی کا یہ گوشہ بڑا ہی اہم ہے اور قابل احترام بھی۔ اچھے فنکار اور اچھے انسان کی نشانی اور شناخت یہی ہے کہ وہ اپنی نجی زندگی میں بھی ذمہ دار رہے ورنہ وہ فن کار یا شخص جو اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں اور قریبی رشتہ داروں سے انصاف نہ کرسکے وہ بھلا اپنے دوستوں سے یا پڑوسی سے یا قوم سے کیا انصاف کرسکتا ہے؟ اور اس سے کیا توقع کی جاسکتی۔

اس وقت تک زینت نے اپنے بارے میں کچھ نہیں سوچا جب تک کہ انہوں نے اپنی ذمہ داریاں پوری نہیں کرلیں۔ بعد میں میں نہیں جانتا کہ زینت نے شاہد کو دریافت کیا یا شاہد نے زینت کو اور یہ بھی نہیں جانتا کہ ان دونوں میں سے کون کس کی توقعات میں شامل ہے۔ اور کون کس کی زندگی کا حاصل ــ لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ شادی کے بعد زینت کے لب ولہجہ پر بڑا گہرا اثر پڑا۔ اور صیغہ مذکر کا استعمال آہستہ آہستہ کم ہوتا گیا۔

یہ شاہد کا کمال نہیں۔ زینت کا اعجاز ہے۔

آخر میں ایک راز کی بات بتادوں اور وہ یہ ہے کہ اسکالر ڈاکٹر زینت ساجدہ اپنے شوہر ڈاکٹر حسینی شاہد سے بے حد ڈرتی ہیں۔ شاہد کے حکم کے بغیر گھر کے اڈمنسٹریشن کا کوئی تنکا بھی نہیں کھڑکتا یہی نہیں بلکہ زینت اپنے میاں کے سامنے چیں تک نہیں کرتیں خواہ وہ ادبی گفتگو ہو، یا علمی یا سیاسی یا کوئی اور۔ یوں مسکراتی ہوئی پان بناتی بیٹھتی ہیں جیسے سونیدگھر لوتسر کی کوئی خاتون جسے دھوبی کا حساب لکھنے کے سوائے کچھ نہیں آتا۔

وہ لمحہ بڑا ہی دلچسپ ہوتا ہے جب شاہد اپنی میڈم ڈاکٹر زینت کو کسی بات پر ڈانٹ پلاتے ہیں اور انہیں مزید کچھ کہنے سے روک دیتے ہیں اور زینت چپ ہوکر بے بسی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھنے لگتی ہیں۔ اس وقت سچ پوچھئے تو طبیعت خوش ہوجاتی ہے کہ واہ شاہد صاحب واہ! آپ نے ہم مردوں کی ناک بچالی۔ ورنہ ہم نے اپنے کئی ایسے دوستوں کو دیکھا ہے جنھوں نے گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ ملازم لڑکیوں سے شادیاں کیں اور شادی کے بعد منہ تک نہیں کھولا۔ جب بھی بات کی بحوالہ متن بات کی اور ہمیشہ متن کے قریب رہے۔ سُنا کہ شاہد کے سسرالی عزیز بھی شاہد سے ڈرتے ہیں۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ البتہ ان کے ایک منہ بولے سالے کو جانتا ہوں جن سے آپ بھی واقف ہیں اور جن کا نام ہے سری نواس لاہوٹی۔

جب لاہوٹی بڑے ٹھاٹھ سے اپنے بہنوئی شاہد سے چائے کی فرمائش کرتے ہیں تو اس موقع سے شاہد پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں اور کہتے ہیں۔

"اجی جناب سالے مارواڑی صاحب! آپ کو شرم نہیں آتی۔ سارا زیور تو رہن رکھ کر ہڑپ کر ڈالا۔ اب آپ سود بھی مانگ رہے ہیں کیا آپ کے ابا جان نے میرے نام کوئی جائداد لکھ چھوڑی ہے!"

شاہد کسی سالے والے کی سفارش نہیں سنتے۔ یہاں تک کہ زینت کی سفارش پر بھی کان نہیں دھرتے۔ زینت کو اس کا پتا ہے۔ اگر کسی بدنصیب نے اصرار کے ساتھ زینت سے سفارش کروادی تو اس کی خیر نہیں۔ اچھا خاصا ہونے والا کام بھی بگڑ کر رہ جائے گا۔ اصل میں شاہد نے زینت کو اپنے کالج کے اڈمنسٹریشن سے الگ رکھا اور کسی معاملہ میں دخل دینے نہیں دیا۔ بس اصول اصول ہے۔

حسینی شاہد سے زینت ساجدہ ایسا ہی ڈرتی ہیں جیسے کوئی بندہ اپنے خدا سے ڈرتا ہے لیکن اس کے باوجود خدا سے محبت کم نہیں ہونے پاتی۔ ابھی چند سال پہلے کی بات ہے کہ شاہد سخت بیمار پڑے اور انھیں پیٹ کے ایک نہیں دو آپریشن کروانے پڑے اور دواخانے میں انھیں ایک لمبے عرصے تک رہنا پڑا۔ بے ہوشی اور نیم بے ہوشی کی کیفیت میں انھوں نے کئی گھنٹے گزارے۔ اس وقت زینت کی حالت کا کچھ نہ پوچھئے۔ یونیورسٹی کیا ساری دنیا کو چھوڑ کر وہ ہفتوں اپنے شوہر کے سرہانے یا پائنتی بیٹھی رہیں چپ چاپ۔ خاموش خاموش۔ صرف گھڑی کی ٹک ٹک سنتی ہوئی یا منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتی ہوئیں!

یہ عبادت نہیں تو اور کیا ہے!

میں شاید یہ بات بتانا بھول گیا کہ زینت بے حد مذہبی خاتون ہیں۔ ماہ رمضان میں پورے روزے رکھتی ہیں اور باقاعدگی کے ساتھ نمازیں پڑھتی ہیں یہی نہیں بلکہ باقی گیارہ مہینوں کی پیشگی نمازیں بھی اسی مہینے میں پڑھ کر حساب چکتا کردیتی ہیں۔ کسی کو برا کہتی ہیں اور نہ کسی کا برا دیکھتی ہیں۔ البتہ زینت ان حضرات سے بے حد الرجک ہیں جو پدما بھوشن یا پدما شری قسم کے ٹائیٹل رکھتے ہیں یا جو کھدر پہنتے ہیں یا پھر کسی یار جنگ بہادر کی اولاد ہیں۔ زینت انھیں کبھی نہیں بخشتیں۔

زینت کو دیکھنے کے بعد یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ سادگی کسے کہتے ہیں۔ ملنے کے بعد شرافت کا مفہوم واضح ہوجاتا ہے اور گفتگو کے بعد زندگی کے معنی کسی چھپے ہوئے راز کی طرح منکشف ہوجاتے ہیں۔ اس لئے کہ زینت ان تمام چیزوں سے عبارت ہیں۔

دیکھئے زینت آرہی ہیں۔ اٹھئے اور بڑھ کر ان کا استقبال کیجئے۔

●●

رحمٰن جامی

علم و دانش کا ہیں اک منشور زینت ساجدہ
تیرگیٔ جہل میں ہیں نور زینت ساجدہ
اپنی استادی میں ہیں مشہور زینت ساجدہ
پڑھتے ہیں اہلِ بصیرت زندگی کا قاعدہ
اور پڑھاتی ہیں انھیں دکتور زینت ساجدہ

لکھنے والوں میں مثالی ان کا ہے زورِ بیاں
جیسے حق گوئی کی خاطر ہی ملی ان کو زباں
ان کے لب پر ہے وہی جو ان کے دل میں ہے نہاں
دوست بھی ان پر فدا دشمن بھی ہے ان پر فدا
ہیں مجسم سیرتِ منصور زینت ساجدہ

آپ ہی اپنی وضاحت آپ ہی اپنا سوال
آپ ہی اپنی بصیرت آپ ہی اپنا جمال
آپ ہی اپنی حقیقت آپ ہی اپنا کمال
آپ خود ہی انتہا ہیں آپ خود ہی ابتداء
گویا بظاہر خود میں جو مستور زینت ساجدہ

لب پہ آتا ہے عقیدت سے ہمیشہ ان کا نام
ان کا ہوتا ہے ہمیشہ قابلِ تعریف کام
پڑھتے رہتے ہیں قصیدہ لوگ انکا صبح و شام
ہر قیادت کرنے لگتی ہے انہی کی اقتدا
رہبری پر سب کی ہیں مامور زینت ساجدہ

ان کا جادو بولتا ہے چڑھ کے یوں لوگوں کے سر
یہ جو کہتی ہیں وہی دنیا کو آتا ہے نظر
ان کی اک اک بات کا ہوتا ہے کچھ ایسا اثر
سُن رہا ہو جیسے کوئی آپ ہی اپنی ندا
کان میں یوں پھونکتی ہیں صور زینت ساجدہ

آپ اپنی ذات سے خود قوم کا ادراک ہیں
ہے عمل بے باک اپنے قول میں بے باک ہیں
پاک ذہن و پاک دل ہیں سر سے پا تک پاک ہیں
سر دی اس تیرگی میں ایک نورانی ردا
ہیں ہمارے حق میں زندہ طور زینت ساجدہ

ہے انہی کے نام سے منسوب اقلیم ادب
اس لیے ہم کو بھی ہے محبوب اقلیم ادب
اس لیے بھی ہے بہت ہی خوب اقلیم ادب
اس لیے بھی اس قدر اس سے ہوا ہے فائدہ
آکے ہوتی ہیں یہاں محسور زینت ساجدہ

آپ کے دوگرامی نامے اس وقت میرے سامنے ہیں۔ پہلا ۲۰؍اپریل ۱۹۸۱ء کا نوشتہ، اور دوسرا ۴؍مئی ۱۹۸۱ء کا۔ نصرت محی الدین نے مجھے بہت پہلے "جشن زینت ساجدہ" کی بات بتلا دی تھی۔ اور میں خوش تھا کہ چلو حیدرآباد کی آنکھیں اس حد تک تو کھلی ہیں کہ وہ اپنے ہیروں کی خیرگی کا متحمل ہو سکے۔ بہ دیر سہی حیدرآباد نے عالم کو پہچانا، زینت کو پہچانا تو سعید بن محمد نقش اور اختر حسن کو بھی جلد ہی پہچان لے گا۔

باور کیجئے دل میں بہت کچھ تھا۔ نصرت سے وعدہ بھی کر رکھا تھا کہ لکھوں گا۔ میں چاہتا تھا کہ وقت نکال کر زینت سے ملوں۔ جی بھر کے باتیں کروں۔ ان کی پہلو دار شخصیت کی سوہنی کو لفظوں میں بند کر دینے سے قبل اعتماد کی اس دولت کو کھوج لوں جو لکھنے والے کے قلم اور روشنائی کا بھرم رکھتی ہے ـــ لیکن آپ کو کس طرح یقین دلا سکوں گا کہ اب تو ان دفتری لعنتوں نے یہاں تک پہنچا دیا ہے کہ سکون سے مر جانا بھی بس میں نہیں رہا۔ کچھ ہی دن ہوئے سرکاری کام سے ایک عہدہ دار کے ہمراہ حیدرآباد آنا پڑا۔ عجیب مجبوری تھی۔ کام زیادہ وقت کم۔ تڑپ کر رہ گیا کسی سے بھی نہ مل سکا۔ یہاں تک کہ شاذ سے بھی نہیں۔ نصرت نے راستے پر پکڑا، دس بارہ منٹ اس کی محبتوں کی نذر ہوئے اور بس۔ زیادہ وقت اسے بھی نہ دے سکا کہ بیٹے، بہو اور بیٹیا

اقبال متین

ایک خط

محترمہ ڈاکٹر رشید موسوی صاحبہ، جنرل سکریٹری جشنِ زینت ساجدہ کمیٹی کے نام!

کی ذمہ داری [illegible] سو رہے تھے [illegible] ہو کر جب [illegible] دیکھی تھی۔ نصرت نے بھی اصرار نہیں کیا۔ مخدوم بھائی کا بیٹا ہے نا [illegible] ہوئی ریزہ ریزہ شخصیت کی دھجیاں سینے میں چھپا لینے کا گر جانتا ہے۔ اُلٹے میری خاطر نوید کو ڈھونڈتا پھرا۔ نوید میری تلاش میں نکل پڑا تھا۔ جانتا تھا کہ بابا پابند وضع تو ہیں۔ پابند وقت نہیں۔ اس کے باوجود میرے دل کے عارضے نے جو اب میری نظر میں قصۂ پارینہ ہو چکا ہے، اس کو اپنی بیوی کے پہلو میں بھی چین سے بیٹھنے نہ دیا اور وہ سیدھے گھر پہنچا کہ میں بہت تھک جانے کے باعث کہیں پھر دلِ بیمار کی مزاج داری میں تو نہیں لگ گیا۔ زندگی اس سلسلہ در سلسلہ محبتوں سے وابستگی کا نام ہے، تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے زینت نے دُور دُور رہ کر بھی زندگی سے اس وابستگی کا حوصلہ دیا ہے اس جذبۂ اخلاص کے پیچھے ہو سکتا ہے کہ شاہد کا چہرہ چھپا ہوا ہو کہ کبھی لطیف ساجد، حسینی شاہد اور اقبال متین کی دوستی مثالی تھی، لیکن نہیں زینت بعض معاملات میں وساطت کی قائل نہیں ہیں۔ خاص طور پر محبتیں تقسیم کرنے اور محبتیں بٹورنے میں وہ اتنی بے لاگ اور سیدھی ہیں کہ کوئی بھی سیدھے سیدھے چل کر ان کے دل میں پہنچ سکتا ہے اور وہ بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ کسی بھی دل میں اُتر سکتی ہیں۔ شرط یہ ہے کہ درمیان میں مصلحت نام کی کوئی شئے نہ ہو۔ مصلحت پسندی کے منہ پر تھوک کر گزر جانے والی اس عورت سے سُنا ہے کہ یونی ورسٹی کے کتنے ہی برقع پوش مردوں کے چہروں سے کچھ اس بے دردی سے نقاب نوچ

چھینکی کہ اصلی چہرے سامنے آکر اور بھی پہچانے نہ گئے۔ "دروغ برگردنِ راوی" اگر یہ دروغ ہے۔ رہ گئی سچ کی بات سو میں اتنا جانتا ہوں کہ لندن پلٹ خاتون کے ہاتھوں میں ایک بھری پچھری ادبی محفل میں زینت نے یہ کہتے ہوئے آئینہ تھمادیا کہ "بی بی اس آئینے میں صورت کم دکھائی دیتی ہے اور دل زیادہ" اگر تم اس کے صیقل کی تاب لاسکو۔ یہ تو آنکھوں دیکھی تھی کانوں سنی یہ ہے کہ زینت نے "کہسار" میں آئینہ سازی کا ایک کارخانہ کھول رکھا ہے جو صرف ایسے ہی آئینے بناتا ہے جن میں چہرے سرے سے دکھائی ہی نہیں دیتے، صرف دل دکھائی دیتے ہیں۔ دیکھیں تو زینت گھاٹے کا یہ کاروبار کب تک چلاتی ہیں کہ لوگ آج بھی صرف اپنی صورتوں کے لئے بلجیم کے آئینوں کے متلاشی ہیں۔

میں چلا تھا آپ کو خط لکھنے، معذرت کے لئے کہ خاکہ لکھنا اتنا آسان نہیں ہے۔ جتنا سمجھ لیا گیا ہے صرف تعریف و توصیف سے ہی خاکہ نہیں بنتا۔ خواہ اس میں کتنی ہی صداقت ہو۔ کسی شخصیت کے خاکے کے معنی یہ ہوسکتے ہیں کہ اس کی شخصیت کاغذی پیرہن میں سانس لیتی محسوس ہو۔ اس کے لیے اس شخصیت کا بہت قریب سے مطالعہ بہت ضروری ہوتا ہے لیکن کیا کروں کہ اس معذرت کا حق بھی زینت نے نہ دیا۔ یہ بھی تو ان کی شخصیت کی طرح داری ہے۔

لیجیئے اب اس کو کیا کروں کہ لفظ معذرت سے ایک بات یاد آگئی۔ اے آئی آر حیدرآباد نے ایک پروگرام ترتیب دیا تھا جس میں افسانہ نگار افسانہ سناتا اور ناقد اس کہانی پر اپنے تاثرات کا اظہار بھی کرتا اور ساتھ ہی افسانہ نگار کے فن پر من حیث المجموع اظہار رائے بھی۔ کہانی پر بات کرتے ہوئے میرے فن کی دردمندی کی بات جب زینت نے کی تو کھلے دل سے مجھے ایک مشورہ بھی دیا، لیکن ان کے لہجے کی غنائیت کے پیچھے آنسو ہی آنسو چھپے تھے۔ میں خوش تھا کہ زینت خود لذتِ گریہ سے محروم نہیں ہیں۔ وہ شائد مطمئن تھیں کہ کیمو فلاج کا فن مجھ سے زیادہ جانتی ہیں لیکن جب وہ فن کا احاطہ کرنے لگیں تو بہت ہی اعتماد اور وثوق کے ساتھ اظہار رائے میں ایک ایسا جملہ بھی کہہ گئیں کہ مجھے فوری شبہ ہوا کہ یہ جملہ کاٹ دیا جائے گا۔

پروگرام نشر ہونے کے دوسرے ہی دن زینت کا فون آیا۔ کہا۔ آپ نے سنا بھی۔

میں سمجھ گیا کہ اشارہ کس طرف ہے، میں نے کہا "جی ہاں نہ صرف سنا ہے، ٹیپ بھی کر رکھا ہے، لیکن میں جانتا تھا کہ یہ سب کچھ ہوگا ہی۔"

پھر آپ نے پہلے ہی بتایا کیوں نہیں۔ میں قبل از قبل ہی ان حضرات کو اس طرح کس دیتی کہ وہ جراًت نہ کرتے۔ میں اپنی رائے میں اٹل ہوں۔ یہ میری اپنی ذاتی رائے ہے اس کو حذف کرنے کا حق اربابِ نشرگاہ کو کس نے دے دیا۔ آپ جانتے ہیں یہ کیوں کیا گیا۔؟"

میں نے کہا "بخش دیجیئے، ہٹائیے بھی!"

کہنے لگیں "نہیں صاحب میں اسے بددیانتی سے بڑا جرم سمجھتی ہوں"۔ بعد میں پتا چلا کہ زینت نے کچھ اس طرح ان کے کان اینٹھے کہ اربابِ نشریات نے ان کے گھر پہنچ کر معذرت کی۔

ایک بات جو میں نے محسوس کی وہ آپ کو بتلادوں ایسا نہیں ہے کہ زینت معاف کرنا نہیں جانتیں۔ وہ بہت معاف کرتی ہیں۔ بعض وقت اس حد تک معاف کرتی ہیں کہ مجھے ان کے عورت ہونے پر شبہ ہوتا ہے، لیکن وہ کسی کو بخشتیں نہیں۔ آپ اس نزاکت کو سمجھ سکتے ہیں۔

اس کے بعد ارادہ تھا کہ کچھ اپنی صفائی پیش کر کے خط ختم کردوں، لیکن دو روز پہلے آئے ہوئے بخار کا سلسلۂ دراز دستی شاید اللہ ہی اللہ جاری تھا۔ اٹھا تو پھر قلم تھامنے کو جی نہ چاہا۔ سوچا ذرا سستا لوں۔ بستر کی استراحت صحت مندوں کے لئے ہے، بیمار کو بستر شاید اور کھدیڑ دیتا ہے۔ ۱۰؍ اپریل سے ۲۲؍ مئی تک دفتر کے جمع بندی کے اہم کام میں بالا نشاط اُلجھا رہا۔ ۲۳؍ مئی کو ناسازیِ مزاج کے باوجود بودھن کے دفتر سب کلکٹری میں صبح سے شام نہیں رات کر دی۔ ۲۴؍ مئی کو ایک دن فرصت کا ملا تو آپ کو جواب لکھنے بیٹھ گیا۔ لیکن مزاج کی ناسازی نے بات بھی مکمل کرنے نہیں دی۔ جب تپ کچھ زیادہ ہی چڑھ گئی تو میں نے اپنے ماتھے پر پٹیاں ڈالنی شروع کیں۔ گھر میں کوئی نہیں ہے۔ بیوی بچے بھی گئے ہوئے ہیں کہ میرا سسرال یہیں ہے۔ ملازم کو بھیج کر ڈاکٹر کو بلوایا۔ پہلے ہی دن " SUN STROKE " تشخیص کی گئی تھی۔ STROKE بھی تو وقت سے پہلے کر دیتے ہیں۔ اتنا طول طویل مذاق کسی بھی اسٹروک کی سرشت ہی میں نہیں۔ میں نے بھی پرواہ نہیں کی، لیکن کمزوری کچھ اس نجعت سے جسم و جان کا حصہ بن رہی تھی کہ اب جاں کے زیاں تک بات پہنچی۔ ڈاکٹر نے بعد معائنہ انجکشن لگا کر دوائیں دیں، اور تنہائی پر رحم کھا کر مشورہ دیا کہ آنے والی صبح سے چون و چرا گھر چھوڑ دوں کہ HOSPITALIZATION ضروری ہے میرے اصرار پر بتلایا کہ دلِ حزیں نے پھر کچھ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی ہے۔ میں نے بھی اعتراف کیا کہ ہاں چار چھ قدم چلتا ہوں تو تنفس بڑھ جاتا ہے بات زیادہ کرتا ہوں تو سانس پھولتا ہے

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت۔ درد سے بھرا ہوا تو تھا ہی اب زیادہ کام کرنے پر بڑا مان گیا ہوگا۔

لہٰذا یہ کلمات آخر کو ہاسپٹل سے لکھ رہا ہوں۔ کل یعنی ۲۵؍ کی صبح شریک ہو گیا۔ دن بھر دلِ نامراد کو مناتا منانا پھسلاتا رہا اور مراد پائی کہ اس نے آپ کا خط آج یعنی ۲۶؍ مئی کی صبح ۵ بجے مکمل کرنے کی اجازت دے دی۔ ان حالات میں ذرا غور کیجئے میرے اربابِ اقتدار، اللہ انھیں انسان دوستی کے سبجیکٹ پر ایک آدھ نائل DEAL کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ میری درخواستیں پڑھ کر لوٹا دیں اور کہلا بھیجا کہ میں ہر حالت میں چلا آؤں۔ ڈاکٹر نے صاف صاف کہہ دیا کہ جن مقامات پر الکشن کے سلسلے میں رات دن آپ کو کام کرنا ہے وہاں وقت پڑے تو کوئی میڈیکل ایڈ بھی نہیں مل سکے گی اور اپنی موجودہ حالت کا لحاظ کرتے ہوئے آپ ڈیوٹی پر جانے کی بات سوچئے بھی نہیں۔ لیکن میرے عہدہ دار قوم کے بہی خواہ ہیں خیر خواہ ہیں۔ الکشن کے قومی کام کو کسی ہندوستانی کی جان سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں، اگرچہ دہ ان کا ماتحت ہو۔ تحصیل دار نے درخواست سے لی کہ انسانی ہمدردی میں ان کے عہدہ سے ابھی مات نہیں کھائی ہے۔ R.D.O صاحب نے انچارج سب کلکٹر صاحب نے درخواستیں، جن کے ساتھ میڈیکل سرٹیفکٹ منسلک تھے۔ واپس کر دیئے۔ میں نے فوری ذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ درخواستیں بھجوادیں کہ اگر وقت آئے تو فراز دار پہ چڑھ کر بھی چلا سکوں کہ دیکھو یہیں کاروانِ سحر ہو سکتا ہے سرٹیفکیٹ کی تصویریں چونکہ زیادہ نکل گئی ہیں اس لیے ایک آپ کے بھی پاس بھجوا رہا ہوں کہ

آہ صد لیب دل کے کریں آہ و زاریاں

تو ہائے گل پکار، میں چلاؤں ہائے دل

زینت کو اور شاہدا کو میرا پیار پہنچا دیئے۔ اب تھک گیا ہوں۔ اجازت دیجئے اور مجھے معاف کر دیجئے۔

لیٹ کر اپنا لکھا پڑھ رہا تھا، خیال آیا کہ اگر چاہیں اور زینت و شاہد بھی پسند کریں تو میرے اس خط کو من وعن اس کتاب میں شامل کر دیجئے جو زینت کی نذر کی جا رہی ہے۔ بس ایک گزارش بہ اصرار کروں گا کہ اس میں سے ایک لفظ بھی کم نہ ہو اس حصے میں سے بھی نہیں جو میں نے دفتریت اور عہدہ داروں کے بارے میں لکھا ہے

خدا کرے آپ کو یہ خط بروقت مل سکے۔ اب مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ اس طویل خط کی نقل رکھ سکوں۔

مخلص :- اقبال متین
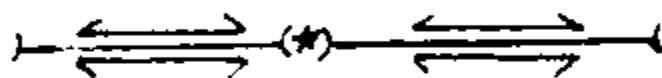
صلاح الدین نیر

شفیق استاد ڈاکٹر زینت ساجدہ ریڈر اردو جامعہ عثمانیہ کو حکومت آندھرا پردیش
کی جانب سے بہترین "استاد ایوارڈ" ملنے کی مسرت میں منعقدہ تہنیتی تقریب کے موقع پر

ایک شاگرد کا نذرانۂ عقیدت!

عرفان کی وہ کونسی منزل پہ کھڑا ہے
نسبت سے تری خود کو جو پہچان رہا ہے

جو کچھ بھی یہاں ہم نے کتابوں میں پڑھا ہے
پہلے وہ ہمیں آپ کے قدموں میں ملا ہے

تہذیب و شرافت کی وہ خوشبو میں بسا ہے
اک لمحہ بھی جو تری محفل میں ملا ہے

سب اہلِ نظر آپ کو ہی دیکھ رہے ہیں
کیا جانیے کیا آپ کے چہرے پہ لکھا ہے

نازاں ہے یہ صد فخر یہاں جامعہ جن پر
ان تازہ اجالوں میں الگ تیری ضیا ہے

اردو پہ عنایت کی نظر خوب ہے لیکن!
اس در سے حکومت کا بھی اعزاز بڑھا ہے

کیا تشنگی ہوتی ہے کبھی پوچھیئے اُس سے
تپتے ہوئے صحرا میں جو برسوں سے کھڑا ہے

شفقت بھی نگاہوں میں ہے شیریں سخنی بھی
جو تجھ سے ملا وہ ترا گرویدہ ہوا ہے

یہ سچ ہے کہ وہ بن گیا ہے قافلہ سالار
دو چار قدم جو ترے ہمراہ چلا ہے

یوں ہی نہیں آئی یہ فقیرانہ مزاجی!
برسوں تری چوکھٹ پہ مرا سر بھی جھکا ہے

محفل سے تری اُٹھ کے کہاں جائے گا آخر
جو شخص ترے پاؤں کی زنجیر بنا ہے

اک نسبتِ دیرینہ ترے در سے ہے جس کو
کب بزمِ رفیقاں میں وہ شرمندہ رہا ہے

اے زینتِ محفل! تری عظمت ہو فزاواں
اس بزم میں ہر لب پہ یہی ایک دعا ہے

یہ وقت ہے استاد سے کچھ مانگ لے نیر
کیوں سر کو جھکائے ہوئے خاموش کھڑا ہے

ایک استاد وہ ہوتا ہے جو اپنی ذات کو درسی کتابوں تک محدود رکھتا ہے۔ اس دورِ تجارت میں جہاں ہر شئے پیمانۂ سود و زیاں سے ناپی جاتی ہو، یہ استاد بھی اپنے ہر لمحے کا حساب چکاتا رہتا ہے، لیکن ـــ ایک استاد وہ بھی ہوتا ہے جو درسی کتابوں کے ساتھ درسِ حیات بھی دیتا ہے، جو ہمیں بتاتا ہے کہ زندگی برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہوتی ہے، جو کارزارِ دنیا میں ہمیں کرم کتابی بننے کے بجائے اخلاق و کردار کی تیغِ جوہر دار عطا کرتا ہے، جو شک کی جگہ یقین، اندھیرے کی جگہ روشنی، مایوسی کی جگہ امید، اور ہراس کی جگہ استقامت سکھاتا ہے، جو صرف علم کی آگہی بخشنے تک اپنی ذات کو محدود نہیں رکھتا، ذوقِ علم کی بھی تخلیق کرتا ہے، جو صرف راستے پر چلنا نہیں سکھاتا، بلکہ نئے راستوں، نئی سمتوں اور نئی جہتوں کے امکانات کی طرف بھی متوجہ کرتا ہے وہ ان تمام صفات سے خود بھی متصف ہوتا ہے، یہی استاد، یہی مدرس دراصل وہ گرو ہوتا ہے جس کے لئے کہا گیا ہے:-

گرو گوبند دو دکھڑے کاکے لاگے پائے
بلہاری گرو آپ کے گوبند دیو بتائے

ڈاکٹر مجاور حسین

جب تک چارمینار ہاتھ اٹھائے مصروفِ دعا رہے

ڈاکٹر زینت ساجدہ میں بھی مشرقی معیار کے استاد، مدرس اور گرو کی صفات پائی جاتی ہیں مقصد کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو، ذات سے الگ ہوتا ہے، اس لئے یہ نہیں کہوں گا کہ تدریس ان کا مقصدِ حیات ہے بلکہ سچی بات یہ ہے کہ تدریس ان کی زندگی کا ناقابلِ تنسیخ جز ہے۔ انھوں نے تینتیس ۳۳ برس کی تدریسی زندگی کو ایک روشن کتاب کی طرح نمونۂ عمل بنا کر پیش کیا ہے۔ مشرقی تہذیب کے اعلیٰ ترین معیار کو اپنا کر انھوں نے شرافت، نیک نفسی بے نیازی اور اپنی شفقتوں سے، طالب علموں کی حوصلہ افزائی کر کے ان کی زندگیاں سنواری ہیں۔ عام طور پر استاد کے سامنے کچھ لکھ کر لے جائیے تو سننا پڑتا ہے: غلط یہ لفظ، وہ بندش بری۔ یہ مضمون سست ـــ مگر ڈاکٹر زینت ساجدہ کے پاس جائیے تو صحیح یہ لفظ، یہ بندش درست، یہ مضمون چست سننے کو ملے گا۔ وہ حوصلہ افزائی فرماتی ہیں دل بڑھاتی ہیں۔ ذرہ کو آفتاب کا ہم پایہ بنا دیتی ہیں۔ یہ حوصلہ افزائی ان کے کردار کا اہم ترین جزو ہے۔ کسی میں بھی صلاحیت دیکھی، ذرا سا جوہرِ قابل نظر آیا، پھر انھیں اسے چمکانے کی دھن ہو جاتی ہے اس دورِ بلا خیز میں جب ہر شخص اپنی پیشانی پر اپنے عقائد کا قشقہ لگائے گھومتا ہے اور اپنے نام سے پہچانا جاتا ہے ڈاکٹر زینت ساجدہ صرف کام دیکھتی ہیں تعصبات، تعینات، تحفظات کی دیواریں گرا کر روشنی کی مخصوص و درس گاہ، یا علاقے میں محدود نہیں

کی جاسکتی ہے اور اسی لیئے ان کے فیوض و برکات کا سلسلہ کنار گنگ و جمن تک پھیلا ہوا ہے۔

وہ محقق بھی ہیں، مورخ بھی، مترجم بھی ہیں اور تخلیق کار بھی ـــ ان کے اکتسابات علمی کی یہ کاش گنگا کا سلسلہ صرف اُردو تک محدود نہیں، تلگو ادب کے لعل و گہر بھی ان کی جوہری نگاہوں نے تلاش کیے ہیں۔ ان میں نہ مذہبی تعصب ہے، نہ لسانی تنگ نظری۔ وہ اردو کی شیدائی ہونے کے ساتھ اردو کلچر کی علم بردار بھی ہیں۔ اردو کلچر نام ہے جمنا کے پانی کی آمیزش کا۔ باہمی احترام، رواداری اور وسیع النظری کا۔ شاید یہی سبب ہے کہ وہ بیک وقت تصوف سے بھی دلچسپی رکھتی ہیں اور ترقی پسند تحریک سے بھی ـــ دونوں میں قدرِ مشترک بھی یہی باہمی احترام، رواداری اور وسیع النظری کا ہے۔

آج دیپاولی کے موقع پر جب دیواروں پر، منڈیروں، گلیوں میں، شاہراہوں پر چراغاں ہے ہمارے دل دہری مسرت سے معمور ہیں ہمارے دلوں کی دُنیا میں آگہی، استاد شناسی اور علم دوستی کے اعتراف کے دیپک جھلملا رہے ہیں۔

محترمہ! آج کے دن ہماری جانب سے ہماری خوشی کے جذبات کا نذرانہ قبول فرمائیں۔ آج کی دُنیا سکوں کی جھنکار میں ہر شئے کو تولتی ہے مگر ہم آپ کے بارے میں یہ بھی جانتے ہیں کہ لکشمی آپ کی دوست تو ہوسکتی ہے، مگر آپ کی دیوی نہیں ـــ آپ کی دیوی تو سرسوتی ہے۔

حضرات، کچھ افراد ایسے ہوتے ہیں کہ اعزاز، منصب، عہدہ، کرسی ان کی شخصیت کو وزن اور وقار عطا کرتا ہے مگر کچھ ایسی شخصیتیں بھی ہوتی ہیں جو اپنی ذات سے اعزاز کو بلندی و رفعت اور اعتبار عطا کرتی ہیں۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ بھی ایسی ہی شخصیت ہیں۔ میں حکومت کے ایک اہم نمائندے اور عوامی رہنما کی وساطت سے حکومت کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اس نے موزوں ترین شخصیت اور بہترین مدرس کو اسٹیٹ ایوارڈ دے کر ـــ اس ایوارڈ کو معتبر بنا دیا ہے ہم ڈاکٹر زینت ساجدہ کے شاگرد ـــ اس پُر مسرت تقریب کے موقع پر اظہارِ تشکر بھی کرتے ہیں کہ جو ایوارڈ چند دنوں تک نصف بہتر کی منزل میں تھا اب مکمل ہو گیا ہے

ساتھیو اور دوستو!

وقت ایک تنکے کی طرح جذبات کے سیلاب میں بہا جا رہا ہے۔ باتیں بہت کہنے کی ہیں اور خوشی ہے کہ مجھ سے بہتر انداز میں ان کی شخصیت کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ایک ہشت پہل شخصیت کی زندگی کے گوشوں پر کچھ کہنے کے لیے مجھ جیسے کج مج بیان اور ژولیدہ گو کے پاس الفاظ کہاں ـــ میرے جیسا کم علم اسے کیسے خراجِ عقیدت پیش کرسکتا ہے جو اگر بزم میں شعلہ نوا ہو تو لفظ انگارہ بن جائیں، اگر حق گوئی کی منزل ہو تو حرف شمشیرِ خاراشگاف بن جائیں! اگر حدیثِ لالہ و گل و سنبل بیان کرے تو ہر فقرہ شاخِ گل نظر آئے اور ہر جملے سے کلیوں کے چٹکنے کی آوازیں سنائی دیں۔ میری نااہلی سے صرفِ نظر اس لیئے کریں کہ آپ میں سے بہت سوں کی طرح میں نے بھی اپنی کلاہِ افتخار میں ڈاکٹر زینت ساجدہ کی شاگردی کا طرۂ امتیاز ٹانک لیا ہے اور اس پر نازاں ہوں۔ یہ نہ سوچیئے کہ میں تو انھیں صرف تین برس سے جانتا ہوں ۱۹۷۷ء میں زندگی میں پہلی بار انھیں ارض سنگم پر اس وقت دیکھا تھا جب دنیاوی اعتبار

بقیہ صفحہ ۸۷ پر

فیض نے راولپنڈی سازش کی اسیری کے دنوں میں ماہ جولائی ۱۹۵۲ء میں ایرانی طلبہ پر ایک نظم لکھی تھی "یہ کون سخی ہیں جن کے لہو کی اشرفیاں چھن چھن چھن چھن" (دستِ صبا صفحہ ۷۳) کوئی چھ ماہ بعد پولیس کی فائرنگ سے کراچی کے چند طالب علم ہلاک ہوئے تو فیض نے ۱۸ جنوری ۱۹۵۳ء کے ایک خط موسومہ ایلس فیض میں لکھا (صلیبیں مرے دریچے میں صفحہ ۱۰۵) "تم چاہتی تھیں کہ کراچی کے طلبہ کے لئے بھی کچھ لکھوں لیکن اس خیال سے نہیں لکھا کہ شاید میں ان سے پورا انصاف نہ کرسکوں۔ یوں بھی ایسی نظم میں اسی موضوع کی تکرار ہوگی جو میں ایرانی طلبہ کے بارے میں لکھ چکا ہوں۔ یہ میری سب سے اچھی نظموں میں سے ایک ہے اور میں نہیں چاہتا کہ اپنے بچوں کو اس سے کم درجے کی چیز پیش کروں۔"

میں نے اوپر کے اقتباس ایک خاص مقصد کے تحت دیئے ہیں حالانکہ ان کا کوئی تعلق زینت ساجدہ یا میرے موضوع سے بالواسطہ یا بلاواسطہ نہیں ہے۔ میں نے اپنی یادوں کے مجموعے "ذکرِ یار چلے" میں اپنے چند خاص احباب کے خاکے لکھے ہیں۔ میر حسن، نورالہدیٰ، اشفاق حسین، رفیق الدین احمد، شہریار کاؤس جی، مسٹر کرجی، علی احمد، مرزا شکور بیگ، سکندر علی وجد، اور دوسرے یار دوست۔ ویسے تو پوری کتاب مجھے بے حد پسند ہے۔ میں بہت کم مایوس ہوتا ہوں مگر

مرزا ظفر الحسن

جادو بیاں جادو نگار

جب کبھی ہوتا ہوں تو نہ دے کمرہ بند کر کے ذکرِ یار چلے کی خصوصاً یارانِ جامعہ والے باب کی ورق گردانی کرتے ہوئے اپنے ان پیاروں کے ساتھ ماضی میں گم ہوجاتا ہوں۔ مخدوم کا نام میں نے یوں نہیں لیا کہ وہ تو ایک لحاظ سے اس کتاب کا محور اور مرکز ہے۔ ۱۹۷۸ء میں حیدرآباد میں تھا تو اشفاق مرحوم کی دختر نیک اختر سیمیں اصغر نے مجھ سے فرمائش کی کہ وہ اشفاق کے مضامین کا مجموعہ "سرود رفتہ" مرتب کررہی ہیں اور میں اشفاق پر کوئی نیا مضمون لکھ دوں۔ میں نے سیمیں بیٹی سے معذرت کی اور کہا کہ اشفاق پر جو کچھ میں نے ذکرِ یار چلے میں لکھا ہے اب اس میں اضافہ میرے بس کی بات نہیں کیونکہ نہ صرف وہ خاکہ بلکہ پوری کتاب میں نے ایک خاص الہامی کیفیت میں لکھی ہے جس کا عود کر آنا اب مجھے ممکن نہیں معلوم ہوتا۔

زینت ساجدہ نے مجھے اس وقت چونکایا بلکہ جھنجھوڑا جب اس کا مضمون "من ترا حاجی بگویم" صبا کے مخدوم نمبر میں پڑھا۔ شروع کیا تو پڑھتا ہی گیا پڑھتا ہی گیا اور جب ختم ہوگیا تو پھر شروع سے پڑھنے لگا۔ اب تک نہ جانے کتنی مرتبہ پڑھ چکا ہوں اور کتنی بار پڑھنے کی ہوس ہے بس یہی ہے معجزۂ فن تخلیق کا۔ اس مضمون نے مجھ پر ایک تاثر یہ چھوڑا کہ زینت ساجدہ مخدوم اور صحبتِ حسن جیسوں کی ہم نشین رہ چکی ہے۔ اس نے خود ان لوگوں کو کتنا متاثر کیا معلوم نہیں مگر ان کی صحبت سے ضرور مستفیض ہوئی۔ دوسرا تاثر یہ ہے کہ زینت کی زبان اور ذہن دونوں میں بڑی ہم آہنگی ہے۔ ذہن فکر فراہم کرتا ہے اور زبان

اس فکر کے اظہار کا موثر ہی نہیں موقر اور معتبر ذریعہ ہے ۔ یہ اور دوسری ایسی باتیں ہیں جن کی بنا پر میں چاہتا تھا کہ زینت پر جو کچھ لکھوں اس کا معیار وہی ہو جو ذکر یار چلے کی تحریروں میں محسوس ہوتا ہے اور جیسا کہ فیقی نے لکھا اور میں اوپر نقل کر چکا ہوں ۔" میں نہیں چاہتا کہ ...... ۔ اس سے کم درجے کی چیز پیش کروں ۔حیدرآباد سے اتنے تقاضے آئے اور اب میں اتنا مجبور ہو گیا ہوں کہ ان محبت آمیز تقاضوں کے آگے سپر ڈال دوں اور اچھا برا جیسا بھی لکھا جاتا ہے پورے خلوص کے ساتھ لکھ کر بھیجدوں ۔ میری دقت یہی نہیں تھی کہ میں معیار یا اپنی پسند کے پیچھے بھاگ رہا تھا بلکہ گزشتہ چار چھ ماہ سے علیل ہوں اور ایک عارضۂ چشم (کالا پانی) نے مجھ سے میرا قلم ہی نہیں سارا چین اور سکون چھین لیا ہے ۔چار چھ ماہ سے اپنے عزیز ترین دوستوں اور خصوصاً "یاران دکن" کو ان کے خطوط کے جواب دینے کی بھی ہمت نہیں رہی ۔ ایسے میں زینت جیسی زندہ دل اور شگفتہ مزاج قلمکار پر مجھ سے زبردستی لکھوانا مجھ سے زیادہ زینت پر ظلم کرنا ہے ۔ مجھے اپنے سے زیادہ زینت کی فکر ہے کہ وہ یہ ظلم کس طرح برداشت کرے گی

فبروری ۱۹۷۸ء میں حیدرآباد پہنچا ۔ ہمدم دیرینہ شہاب الدین کو ساتھ ساتھ رکھا ۔ خود نہ رکھتا تو وہ خود خلوص اور پیار سے مجبور مجھے ساتھ رہتا ۔ میں نے کہا زینت ساجدہ سے ملنا ہے ۔ شہاب بولا ہاں پہلے نظام کالج چلیں ۔ زینت سے مل لیں گے پھر آتے ہوئے حسینی شاہد کی مزاج پرسی کے لئے جائیں گے ۔ شاہد کا آپریشن ہوا ہے دونوں نظام کالج پہنچے ۔ ٹھیک طرح علیک سلیک اور مزاج پرسی بھی نہ ہوئی تھی کہ زینت نے فوراً ایک توپ داغی ۔ شہاب سے کہا ۔ "شہاب ، بہترین موقع ہے ظفر صاحب تیس سال کے بعد حیدرآباد آئے ہیں ۔ تم مر جاؤ تو ان کی صدارت میں تمہارا شاندار تعزیتی جلسہ ہو جائے گا ۔" شہاب فقرہ باز قسم کا آدمی تو نہیں ہے پھر بھی بولا ۔" اگر تم ضمانت دو کہ من تراحاجی بگویم کے معیار کا مضمون مجھ پر لکھو گی تو مر جاتے ہیں ۔" شہاب نے تو خیر جان چھڑانے اور جواب دینے کی خاطر یہ فقرہ کہا تھا مگر اس میں ایک صداقت چھپی ہوئی ہے ۔ کوئی مانے نہ مانے اب زینت اس معیار کا مضمون نہیں لکھ سکتی ۔ اس سے زینت کے قلم کی تحقیر مقصود نہیں ہے بلکہ یہ بتانا ہے کہ ہر قلمکار کی ہر تحریر شاہکار نہیں ہوتی ۔ مخدوم پر زینت کے مضمون کو میں بہت اونچا مقام دیتا ہوں ۔ نہ آج تک مجھ سمیت کسی نے ایسا شاہکار تخلیق کیا ہے اور نہ مستقبل میں ایسی کوئی امید کی جاسکتی ہے ۔ آج تک کسی نے ایسا چنچل مضمون نہیں لکھا ۔

مخدوم کی طرح زینت میں بھی ایک خو یہ ہے جس محفل میں بیٹھتی ہے توجہ کا مرکز بن جاتی ہے جس کی وجہ اس کی زبان ہے ۔ زود گو ہے ، پُر گو ہے مگر اپنی زبان کو ضائع نہیں کرتی ۔ کوئی نہ کوئی نکتہ لطیفہ یا کام کی بات ضرور کرے گی ۔ شہاب نے اصرار کیا کہ فوراً میری دعوت کرے اور وہ بھی ایسی ویسی نہیں مرغ و ماہی والی دعوت ۔ چنانچہ ہم گئے ۔ پُر لطف صحبت رہی ۔ زینت ہی کا پکایا ہوا بڑا لذیذ کھانا کھایا اور جب ہم لوٹنے لگے تو زینت نے کہا :" شہاب صاحب ایک تنخواہ دار ملازم سے مہینے کی آخری تاریخوں میں دعوت کی فرمائش ـــــ تم نے کچھ تو غور کیا ہوتا "

زینت کئی اعتبار سے بڑی ہی بے نیاز خاتون ہے اور باتوں کو تو چھوڑیئے زینت نے کبھی ہندوستان گیر

شخصیت بننے کی کوشش نہیں کی ۔ "کوشش" سے میری مراد تشہیر نہیں ہے ۔ نہ یہ کہ اپنا ڈھول پیٹا جائے ۔ صبح اُٹھے گھر کا کام کاج کیا کپڑے بدلے، کالج گئے درس و تدریس سے فراغت پائی کہیں کوئی جلسہ ہوا تو تقریر کر دی، کسی ادارے کی نشست ہوئی تو مشورہ دے آئے ۔ رات کا کھانا کھایا، کچھ پڑھا اور سو گئے ۔ ویسے اس پروگرام میں کوئی خرابی نہیں مگر اس روزانہ، ہفتہ بھر کے اوسطاً نہ پروگرام میں تخلیقی کام کا کوئی نشانہ نہیں ملتا ۔

ممکن ہے زمان و مکاں کے بُعد کی وجہ سے میں زینت ساجدہ کی تخلیقی سرگرمیوں سے ناواقف ہوں، ممکن ہے کچھ کام کیا ہو جو میری نظر سے نہ گزرا ہو مگر جن معروف پاکستانی ادبی حلقوں میں ہندوستانی ادبی کاوشوں اور خاص طور سے دکن کی کوششوں کا ذکر ہوتا ہے ان میں اور نام تو آتے ہیں زینت ساجدہ کا نہیں آتا ۔ یا آتا ہے تو محض شگفتہ تقریر کے باب میں ۔ زینت نے ایک زمانے میں افسانے لکھے اور اپنا مجموعہ بھی شائع کیا تھا مگر وہ پرانے دنوں کی بات ہے ۔ تقریر ہوا میں تحلیل ہو کر گم ہو جاتی ہے تحریر زیادہ دنوں تک یاد رہتی ہے

مخدوم والا مضمون پڑھنے اور زینت سے ملنے کے بعد میرا اندازہ ہے کہ انھیں طنز و مزاح کی طرف توجہ کرنی چاہیئے ۔ اور اپنے مضامین بندھیا چل کے اُس پار چھپنے والے رسائل کو بھیجنا چاہیئے ۔ ہندوستان میں مقابلتاً کتابت، طباعت کاغذ وغیرہ ابھی سستے ہیں ۔ ان پانچ دس برسوں میں جس نے جو چھپوا دیا چھپ گیا اس کے بعد مہنگائی اتنی بڑھ جائے گی کہ شاید شادی کے دعوت نامے چھپوانا بھی مشکل ہوگا ۔ مجھے نہیں معلوم کہ زینت کا اصل یا پسندیدہ موضوع کیا ہے (شاعری نہیں ہے یہ میں جانتا ہوں ورنہ مشاعروں میں دھوم مچی ہوئی ہوتی) جو بھی ہو اس پر کچھ ٹھوس کام کریں اور اپنے سینہ میں جو کچھ علم ہے بزرگوں اور اساتذہ سے بھی جو کچھ حاصل کیا ہے اسے آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ کر دیں جس کی واحد صورت کتاب ہے ۔

جب سے میں نے دکن چھوڑا ہے جامعہ عثمانیہ اور سرزمین دکن نے بہت سے فارغ التحصیل اور صاحبانِ علم پیدا کئے اور مجھ سے اور مخدوم سے نسبتاً کم عمر ادیبوں میں کئی ایسے ہیں جو صاحبِ کتاب بھی ہوئے اور اساتذہ بھی ۔ مگر جو اعتماد میں نے زینت ساجدہ میں دیکھا کسی اور میں نہ ملا ۔ جوہر قابل کے علاوہ زینت مخدوم کے شانے سے شانہ ملا کر بڑی سے بڑی محفل میں بیٹھی ہوگی ۔ اور مخدوم نے ضرور محسوس کیا ہوگا کہ وہ ایک ہم رتبہ قلمکار کے ساتھ بیٹھا ہے ۔ زینت میں یہ اعتماد اس کے علم نے بھی پیدا کیا ہے ۔ وہ یقیناً صاحبِ علم ہے

ایک مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد (علی گڑھ یونیورسٹی) نے مجھے ایک خط لکھا جس میں ۔ ۔ ۔ ۔ زینت کی بھی تعریف تھی انھوں نے اظہارِ افسوس کیا کہ زینت کا صحیح مقام جامعہ عثمانیہ ہے جو اسے نہیں دیا گیا ہو سکتا ہے اس میں مقامی سیاست کا کوئی دخل ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ زینت کی بے نیازی آڑے آئی ہو ۔ میری دانست میں زینت نے اپنی تخلیقی سرگرمیوں کی وجہ سے وہ شخصیت نہیں بنائی جس نے تقریری معرکوں کی وجہ سے اُسے نہایت بلند و بالا مقام پہ پہنچایا ۔ زینت کے قبضے میں جادو نگار قلم ہے زبان ہی نہیں اس کا قلم بھی جادو جگاتا ہے میری دعا اور تمنا ہے کہ زینت تقریر کے ساتھ ساتھ بلکہ اب تو تقریر سے زیادہ تحریر کی طرف مائل ہو ۔ اس کا ذہن کیسی کیسی باتیں سوچتا اور زبان کس خوبصورتی کے ساتھ ادا کرتی ہے میرے متعلق کہا ظفر یہاں سے جاتے ہو صاحب کچھ سے گئے صرف اپنی جوانی چھوڑ گئے اور اسی باعث "ذکر یار چلے" جیسی کتاب لکھ سکے ۔ فیض کے متعلق کہا کہ انگریزی میں عشق کرتے ہیں اور اردو میں شاعری ــــ زندہ باد ۔ شاد باد ●

اے۔ جی۔ فاروقی

زینت ساجدہ

زینت ساجدہ نام ہے متضاد صفات اور چند معصوم سی کمزوریوں کا۔ یہ خوبیاں اور خامیاں ان میں کچھ اس طرح پیوست ہیں جیسے روشنی اور سائے (LIGHT AND SHADE) کے امتزاج سے کوئی دلکش شخصیت ابھرے۔ آج سے کوئی بائیس سال پہلے میرا تبادلہ آل انڈیا ریڈیو، دھارواڑ سے حیدرآباد ہوا تھا۔ یہاں آنے کے بعد انگریزی کا شعبہ اور اردو کے چند پروگرام میرے سپرد کئے گئے۔ پولیس ایکشن سے پہلے ہم دکن ریڈیو کے پروگرام بڑی دلچسپی سے سُنتے تھے۔ اور حق بات یہ ہے کہ یہاں کے بعض غزل گانے والے فنکاروں کا ہندوستان بھر میں جواب نہ تھا۔ یہاں سے نشر ہونے والی تقاریر، ڈرامے، اور فیچر بھی اعلیٰ معیار کے ہوتے تھے۔ یہاں آنے کے بعد میں نے شجاع احمد صاحب سے، جو اُردو سیکشن کے ایک سرگرم رُکن تھے، کہا کہ میں حیدرآباد کے ممتاز ادیبوں اور شاعروں سے ملنا چاہتا ہوں۔ اگر ان کی کوئی فہرست ہو تو میں دیکھنا چاہوں گا۔ شجاع صاحب نے فرمایا کہ اُن کے پاس یہاں کے دانشوروں کی فہرست ہے۔ اس فہرست کو دیکھ کر معلوم ہوا کہ وہ دس سال پُرانی ہے اور بہت سے دانشور اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اور فہرست میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ آٹھ دس دن میں نئی فہرست تیار ہوئی۔ اس فہرست میں انگریزی کے حروفِ تہجی کے لحاظ سے زینت ساجدہ کا نام سب سے آخر میں تھا لیکن میں ان سے سب سے پہلے ملا کیوں کہ میں جہاں رہتا تھا وہاں سے ان کا گھر کچھ زیادہ دور نہ تھا۔ چنانچہ ایک اتوار کو سہ پہر میں، میں اُن سے ملنے گیا۔ زینت ساجدہ اور اُن کے شوہر حسینی شاہد صاحب گھر ہی پر تھے۔ دونوں میاں بیوی بڑے تپاک سے ملے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اس طرح باتیں کر رہے تھے جیسے مجھ سے برسوں سے واقف ہوں۔ دونوں ہر پانچ منٹ کے بعد ایک ایک پان کھاتے اور جلد ہی دوسرے پان کی طلب انہیں ستانے لگتی۔ میں پان نہیں کھاتا لیکن دونوں کو بڑے چاؤ سے پان کھاتے دیکھ کر میرا بھی جی چاہا کہ پان کھاؤں لیکن دو گھنٹے کی نشست میں انہوں نے بھولے سے پان پیش کرنے کی بات نہ پوچھی۔ شام ہو رہی تھی زینت ساجدہ کی دلچسپ بے تکان باتوں کی یاد لئے میں گھر آگیا اور سوچتا رہا کہ یہ سانولی سلونی خاتون کتنی ذہین، کس قدر سادہ دیرینہ کار اور شگفتہ مزاج ہے۔ اس کے بعد ریڈیو اسٹیشن پر دو تین بار اُن سے اور ملاقاتیں ہوئیں اور ضمناً سرسری طور پر مجھے معلوم ہوا کہ انھوں نے دکن ریڈیو کے کن کن پروگراموں

میں حصہ لیا تھا۔

تھوڑے دنوں کے بعد "ریڈیو ویک" آگیا۔ اس ہفتہ میں آل انڈیا ریڈیو کے ہر اسٹیشن سے مدعو سامعین کے سامنے خاص پروگرام پیش کئے جاتے ہیں۔ شاذ تمکنت صاحب اُس زمانے میں عثمانیہ یونیورسٹی میں ایم۔ اے کے طالب علم تھے۔ شام میں وہ اپنا کچھ وقت ریڈیو اسٹیشن پر بھی گزارتے تھے۔ ان کی وجہ سے پروگراموں کی تشکیل میں مجھے بڑی مدد ملتی تھی۔ چنانچہ ریڈیو ویک میں دو خاص پروگرام مدعو سامعین کے سامنے پیش کئے گئے۔ ایک تو بچوں کے پروگرام میں فیچر "جانوروں کی کانفرنس" پیش کیا گیا ریڈیو ویک کا افتتاح اسی پروگرام سے ہوا تھا۔ شاذ صاحب نے بڑی محنت سے اس کا اسکرپٹ لکھا تھا اور فائن آرٹس اکیڈمی کے ذہین فنکاروں نے سامعین کے سامنے بڑی کامیابی سے اسے پیش کیا تھا۔ اُس وقت کے گورنر شری بھیم سین سچر اور اُن کی بیگم صاحبہ کو یہ پروگرام بے حد پسند آیا تھا۔ دوسرا پروگرام زینت ساجدہ نے میرے ایما پر ویمنس کالج کی طالبات کی مدد سے پیش کیا تھا یہ ویرائٹی پروگرام تھا اور چھوٹے چھوٹے آئٹموں کو کامنٹری کے ذریعہ جوڑا گیا تھا۔ ریہرسل اور پیش کش کے دوران میں نے زینت ساجدہ کے کئی روپ دیکھے۔ ان کی طالبات اُن سے بے پناہ محبت ہی نہیں بلکہ اُن کی پرستش کرتی ہیں۔ وہ بھی انھیں بے حد چاہتی ہیں لیکن ذراسی لغزش پر اُن کا جلال "ددگا" کے جلال سے کم نہیں ہوتا۔ معصوم شگفتہ چہرے سہم جاتے کسی کی آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگتے۔ کوئی اتنی سراسیمہ ہو جاتی کہ سیدھی بات بھی اُس کے منہ سے نہ نکلتی۔ لڑکیوں کی یہ کربناک حالت ان سے دیکھی نہیں جاتی۔ وہ بے اختیار انھیں گلے لگا لیتیں۔ ریہرسل کے دوران یہ ڈراما اکثر ہوتا۔ اور ہر بار ٹریجیڈی چشم زدن میں کامیڈی بن بدل جاتی۔ زینت ساجدہ بے حد حساس ہیں۔ وہ اوروں کی غلطی فوراً معاف کرسکتی ہیں لیکن خود کو معاف کرنا انھیں نہیں آتا۔ ذراسی غلطی بھی انھیں ہفتوں مغموم رکھتی ہے۔ شاید یہ ہر پرفیکشنسٹ (Perfectionist) کا مقدر ہے۔

دس پندرہ سال کے بعد ایک دن ایسا آیا کہ زینت ساجدہ آل انڈیا ریڈیو کی سنٹرل ایڈوائزری کمیٹی کی ممبر بن گئیں۔ یہ ہمارے اسٹیشن کے لئے بڑے اعزاز کی بات تھی۔ مرکزی وزارت میں اس وقت محترمہ اندرا گاندھی انفرمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ کی وزیر تھیں اس کمیٹی کے اجلاس اکثر اندرا جی کی صدارت میں ہوتے تھے۔ زینت ساجدہ کے خلوص کا یہ عالم تھا کہ وہ پوری تیاری کے ساتھ ہر میٹنگ میں شرکت کرتیں، اور اردو پروگراموں کی بہتری کے لئے جب دیکھتیں کہ بات بنائے نہیں بنتی تو اپنی بات پر اڑ جاتیں اور کبھی اپنی خطابت، کبھی خفگی اور کبھی اپنی دلنواز مسکراہٹ سے ہاری بازی جیت لیتیں۔

زینت ساجدہ کی بے شمار خوبیوں کے ساتھ ساتھ اُن میں بچوں کی سی چند خامیاں بھی ہیں۔ پابندیٔ اوقات اُن کے لئے ایک عذاب ہے اور اس عذاب کو وہ کبھی برداشت نہیں کرسکتیں۔ تاہم وہ بڑی سنجیدگی سے کوشش کرتی ہیں کہ وقت کی پابندی کریں لیکن بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جنھیں وقت کبھی اپنا پابند نہیں بنا سکتا۔ زینت ساجدہ کا شمار اس زمرہ کے صفِ اول کے لوگوں میں ہے۔

ان کی بھولنے کی عادت سے کبھی کبھی بڑے پرلطف نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ میری بڑی لڑکی کی شادی نمائش کلب میں تھی۔ صبح نکاح تھا، دوپہر میں لنچ تھا کیوں کہ لڑکی اسی شام رخصت ہو کر پونا جا رہی تھی۔ دوپہر میں لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ میں ہال کے دروازے

پر کھڑا تھا۔ دیکھا کہ زینت ساجدہ بڑا سا ہینڈ بیاگ لئے جھومتے جھامتے چلی آرہی ہیں آتے ہی پوچھا۔ آپ یہاں کہاں؟ میں نے کہا۔ آج شائستہ کی شادی ہے یہاں کھانا کھا رہے ہیں۔ کہنے لگیں "ارے میں سمجھی شادی کل ہے اور ایڈن باغ میں ہے۔ مجھے دینا کالج میں کچھ کام تھا سو ادھر چلی آئی اور اب آپ کو دیکھا تو سوچا پوچھوں یہاں کیا ہو رہا ہے؟" میں نے کہا آپ آگئیں ہیں تو کھانا بھی کھا لیجئے۔ کہنے لگیں کھانا تو میں کھا چکی ہوں اب کیا کروں؟ میں ہنسنے لگا اسعد جیسے آئی تھیں ویسے ہی چلی گئیں۔ اب چھوٹی بیٹی کی شادی کا بھی ذرا سا تذکرہ سُن لیجئے۔ شادی میں شریک ہوئیں شادی خانے کے زنانے میں تھیں۔ مجھے بلوا بھیجا۔ میں سمجھا شاید پابندیٔ وقت کو جتانے کے لئے بلایا ہوگا — گیا تو کہنے لگیں "ارے آپ تو ہمارے رشتہ دار ہوگئے دلہا ہمارا عزیز ہوتا ہے"۔ میں نے کہا "آپ تو پہلے ہی سے ہمیں عزیز تھیں" کچھ توقف کے بعد فرمایا "یہ آپ میں گھور کر کیوں دیکھ رہے ہیں"؟ میں نے کہا آج آپ کے لباس کا انتخاب، انتخاب لاجواب ہے"؛ خوش ہو کر فرمایا "چلئے آپ کو پسند آیا۔ مجھے تو کچھ عورتیں اور لڑکیاں عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھیں"۔ "خدا آپ کو نظر بد سے بچائے کہہ کر میں پھر اپنی جگہ لوٹ آیا۔

اکثر مروت میں آکر زینت ساجدہ ایسے جلسوں کی صدارت قبول کرلیتی ہیں اور انھیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ صدر صاحبہ کو کیا کہنا ہے بگڑی ہوئی بات کو وہ جلد بھانپ لیتی ہیں اور بڑی خوش اسلوبی سے چند ایسی باتیں کہہ جاتی ہیں کہ لوگ واہ وا کرنے لگتے ہیں یہ کرشمہ ہے اُن کے مزاج کا اور خود پر ہنس لینے کی صلاحیت کا۔

میں نے زینت ساجدہ کی تمام کتابیں نہیں پڑھیں لیکن جو بھی پڑھیں اُنھیں پڑھ کر یہی احساس ہوا کہ قدرت نے جو صلاحیت انھیں عطا کی ہے اس سے پورا استفادہ انہوں نے نہیں کیا ہے۔ انگریزی میں کسی نے کہا ہے کہ ادبی گناہوں کے سائے بہت گہرے ہوتے ہیں۔ زینت ساجدہ کے ادبی گناہ (تخلیقات) اگرچہ بہت دقیع، جامع اور گہرے ہیں۔ ان کا طرز نگارش ان کی دلکش شخصیت کی صحیح عکاسی بھی کرتا ہے۔ وہ جو کچھ لکھتی ہیں بہت غور و فکر کے بعد بہت سوچ سمجھ کر لکھتی ہیں لیکن اگر وہ سنجیدگی سے کسی دقیع تصنیف کا ارادہ کریں تو یقیناً وہ اُن کی پہلی تصنیف ہوگی جو ان کی صلاحیتوں کو صحیح طور پر اُجاگر کرے گی۔

زینت ساجدہ کا سب سے بڑا وصف ان کی وضع داری ہے جسے وہ ہر شخص کے ساتھ اس خوبی سے نباہتی ہیں کہ بے شمار ماہ و سال گزرنے کے بعد بھی اس میں ذرا فرق نہیں آتا۔ یہ ان کی پرخلوص شخصیت اور پختگیٔ کردار کی دین ہے۔ میں کیا اور میری بساط کیا لیکن مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ پروفیسر آغا حیدر حسن، زینت ساجدہ کے کتنے قدردان تھے اور انہیں کس قدر چاہتے تھے۔ آغا صاحب نے زینت ساجدہ کے بارے میں بہت دلچسپ واقعات سنائے تھے لیکن افسوس میرے ذہن سے بہت سی باتیں محو ہوگئیں اور واقعات بھی خلط ملط ہوگئے۔ اردو ہال کے بانی اردو پروفیسر حبیب الرحمٰن بھی زینت ساجدہ کو بیٹی کی طرح چاہتے ہیں اور یہ بھی انھیں بابا کہہ کر مخاطب کرتی ہیں۔ دیکھنے والے جب یہ منظر دیکھتے ہیں تو بے اختیار ان کے دل سے دعا نکلتی ہے کہ اردو کے یہ دونوں پرستار اور خدمت گزار تادیر زندہ سلامت رہیں۔

مومن خاں شوق

★

نازشِ دکن زینت ساجدہ

دکن کی ایک مخلص معتبر
اور موہنی سی شخصیت
دمِ تقریر جس کے نطق سے بادِ بہار آئے
عبارت جس کی اپنے عہد کی تنویر کہلائے
ذہانت اور ذکاوت میں مثالی
حُسنِ تہذیبِ دکن کا اک مرقع
ہماری "جامعہ عثمانیہ کو ناز ہے" اُس پر
اُسی کو زیب دیتی ہے دکن کی بزم آرائی
وہ جس کا نام "زینت" ہے وہ سرتا پا قدم زینت
ادب، تہذیب اور کلچر کا سرمایہ
وقارِ فکر و فن

تہذیب اخلاص و مروت
پیکرِ شائستگی
خدا رکھے سلامت باکرامت
شوق کی اتنی دعا ہے۔

ممتاز حبیب
ریڈر سیاسیات ویمنس کالج
عثمانیہ یونیورسٹی

زینت ایک دوست

تقریباً نصف صدی ایک انسان کی زندگی میں معمولی عرصہ نہیں ہے۔ آج کل تو تغیرات اتنی تیزی سے ہورہے ہیں کہ پچھلی نصف صدی پر طائرانہ نظر ڈالی جائے تو محسوس ہوتا ہے زمانہ بالکل بدل گیا ہے۔ اس متن میں سوچیئے کہ زینت اور میں ایک دوسرے کو اتنے عرصہ سے جانتے رہے ہیں۔ زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ساتھ قریب ہوتے رہے ہیں۔ بیگانگی کے پردے بعض وقت لمحوں میں بھی اٹھ سکتے ہیں، کبھی مہینوں سالوں اور دہوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر جو چیز آہستہ آہستہ بڑھتی ہے اور نشو ونما پاتی ہے اس کی جڑیں مضبوط اور اس کی ساخت زیادہ مستحکم ہوتی ہے۔ ڈاروِن کے نظریہ ارتقاء میں آپ یقین کریں یا نہ کریں، سائنس سے لے کر مذہب تک اور مشاہدہ کی دریافتیں بتاتی ہیں کہ ارتقاء ہی کائنات کا مستقل اصول ہے۔ اس روشنی میں اس دوستی کی نوعیت بتانا مقصود ہے جو زینت کے اور میرے درمیان رہی ہے۔ پہلے ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا، پھر بات چیت کی، پھر ساتھ رہے، ساتھ کام کیا اور آہستہ آہستہ قریب ہوتے گئے۔ زینت کے مقتضائے طبیعت کے لحاظ سے جو ایک ملاقات میں ملنے والوں کو گرویدہ کرلیتی ہیں اتنے لمبے **PROCESS** سے گزرنا ضروری نہ تھا۔ مگر میرا مقتضائے طبیعت اس کے الٹ تھا۔ آپکو اندازہ ہوگا کہ اس لحاظ سے ہم دونوں کی فطرتیں الگ سی ہیں۔ زینت گفتگو کی بادشاہ ہیں، اور میں خاموش اور تنہائی پسند واقع ہوئی ہوں۔ مگر میلان، دلچسپیوں اور شاید انداز فکر کی یکسانیت نے ہمیں قریب کردیا۔ اتنا قریب کہ وہ باتیں جو میں اپنے قریب ترین عزیز سے بھی نہ کہوں زینت سے کہہ سکتی ہوں۔ سخن فہمی کا کچھ حصہ اللہ نے اپنے کرم سے عطا کیا اور یہی چیز پہلے قدر مشترک بنی۔ ادبیت تو انسانی شخصیت کا ایک پہلو ہوتی ہے اور پہلوؤں کا مشاہدہ تو رفتہ رفتہ ساتھ رہکر ہوسکتا ہے۔ زینت کی شخصیت کے مختلف پہلو ادبیت — سخن شناسی، سخن نوازی، استانیت وغیرہ وغیرہ منظر عام پر ہیں بہت سارے دوستوں نے انکی شخصیت کے ان پہلوؤں یعنی جرأت، بے باکی، صداقت، ہمدردی، صلہ رحمی، ذائقہ شناسی کو بھی اجاگر کردیا ہے۔ یہاں تک کہ ان کی نجی زندگی کے بعض پہلوؤں کو بھی پبلسٹی دے دی۔ یوں تو زینت بذات خود کھلی کتاب

ہیں۔ ان کا ظاہر اور باطن ایک ہے بلکہ میں کہوں گی کہ باطن ظاہر سے بھی اچھا ہے۔ اس لحاظ سے میرے کہنے کے لئے کچھ نہیں رہ جاتا وہ کیسی دوست ہیں اس کے متعلق بھی ان کے دوست آپ کو بتا چکے ہیں۔ میں شاید کچھ اور کہہ کر اس میں اضافہ نہ کر پاؤں گی۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ دوست کی پہچان یہ ہے کہ آپ بے دھڑک اس کے سامنے کہے جائیں۔ موزوں یا ناموزوں بات، اچھی یا بری بات ہر قسم کی بات بلا جھجک اور بے سوچے ہوئے۔ سچا دوست اس ذخیرہ کو دماغی طور پر چھلنی کر لیتا ہے اور اصل رکھ کر باقی ردّی دان کے حوالے کر دیتا ہے۔ اتنے طویل عرصہ میں میں نے زینت کو ایسا ہی پایا ہے۔ اور ایسا کرتے میں وہ ایک برابری والے انسان کے مانند ہوں گی۔ اُنہوں نے کبھی اپنے کو دوستوں سے کسی میدان میں اونچا نہیں سمجھا، ہر ایک کی منفرد صلاحیت کو خندہ پیشانی اور کھلے دل سے مانا۔ کمزوریوں کو قبول کیا اور پورے خلوص کے ساتھ دوستی نباہی۔ استاد کی حیثیت سے شاگردوں کی صلاحیتوں کی پرکھ کی، ادب شناس ہونے کے ناطے ادب کے جواہر پہ ان کی نگاہ ٹھہری، انسان ہونے کے ناطے ہر ملنے والے کے دکھ کو اپنایا، ہمدردی کے خزانے لٹائے، دشمن کی بھی صلاحیت کو پہچانتے اور ببانگ دھل اسکا اعلان کرنے میں ان کا دل چھوٹا نہ ہوا۔ اور یہ سب کچھ احساس برتری کے ساتھ نہیں دل کی فراخی اور ذہن کی وسعت کا اس سے اندازہ کیجئے۔ دوستوں نے دوستی کی حلاوت لی، شاگردوں نے علم کی کھوج کا جذبہ لیا، لکھ کر اور بول کر زینت نے ادب کے نازک اور لطیف نکات کو فراخدلی کے ساتھ پڑھنے اور سننے والوں کے سامنے پیش کیا۔ جس طرح میخوار بھی میخانہ جانے کے لئے کوئی ساتھی ڈھونڈھتا ہے تاکہ پینے کا لطف آئے سخن شناس بھی ادب کی لطافتوں سے محظوظ ہونے کے لئے دوسرے سخن شناس کو ڈھونڈھتا ہے۔ زینت نے بیسیوں ہی ایسے لوگوں کو پایا انہیں اپنے قریب کر لیا۔ نازک خیالی، جذبات و احساسات کا ادراک حقیقت شناسی کی فہم یہ چیزیں اگر کسی ہم مشرب سے بانٹی جا سکیں تو پھر کیا کہنا۔ چاند اور سورج اپنی روشنی کو پورے عالم پر پھیلا دیتے ہیں بخل نہیں کرتے خوبصورتی، جمال اور زندگی بخش عناصر کو اپنا لیا تو اس کی صلاحیت پہ ہے جس پہ ان کی روشنی پڑی ہے کہنا صرف یہ چاہتی ہوں کہ زینت نے کبھی بخل نہیں کیا۔ زینت اور بخل دو متضاد الفاظ ہیں۔ اور خصوصیت کے ساتھ دوستوں سے اُنہوں نے خوب ہی فیاضی اور سخاوت برتی۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ میں نے زینت کے ساتھ اپنا حق دوستی ادا کیا ہے۔ زینت نے اپنے اس رول کا پورا حق ادا کیا مگر ان کی فراخدلی دیکھئے کہ کبھی دوسری جانب سے کمی محسوس کرتے ہوئے بھی ان کی پیشانی پہ شکن نہ آئی۔ کوتاہی دیکھتے ہوئے بھی ہمیشہ معافی دے دی اور چھٹی کر دی۔ "اس سخاوت پر کون نہ مر جائے اے خدا" زینت کی دوستی ہر قسم اور قماش کے لوگوں سے رہی ہے۔ بوڑھوں سے ادھیڑوں سے، جوانوں سے، مردوں سے، عورتوں سے اور بچوں سے، عقلمندوں سے اور بیوقوفوں سے بھی۔ یہ چیز ایک طرف تو ان کی MULTIDIMENSION شخصیت کا اظہار کرتی ہے اور دوسری طرف فطرت کی لچکداریت کی بھی۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں اور سن چکے ہیں اس کا مطلب یہ نہیں کہ اُنہوں نے موقع پرستی سے کام لیا۔ موقع پرستی اور زینت میں تو بعد المشرقین ہے۔ FUNDAMENTALS پہ وہ کبھی سمجھوتہ پہ تیار نہیں ہوتیں۔ اور بہت سختی سے اُن پر جمی رہتی ہیں۔ اگرچہ دوسرا فریق کتنا ہی با اقتدار اور دنیاوی لحاظ سے اونچا ہو۔ خود دوستوں سے معاملہ میں بھی یہی اصول

صرف بات یہ ہے کہ اڑی ہوئی ہوتے ہوئے بھی وہ معاف کر دیتی ہیں۔ ان کی شخصیت میں کھوٹ اور ملاوٹ نہیں ہے۔ وہ ایک کھرے سکّے کے مانند ہیں جس کا چلن بیچنے اور خریدنے والے کو دھوکہ نہیں دیتا۔ جس طرح سورج ڈھلتے ڈھلتے سایہ دراز ہوتا جاتا ہے اسی طرح زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت اونچی ہوتی گئی ہے اور کردار کی اچھائی کا سایہ بڑھتا جاتا ہے۔ ایک فن کار کی انا نے خودی کا روپ لے لیا ہے۔ زندگی کی تینوں منزلوں بچپن، جوانی، اور بڑھاپے کا بڑا متناسب مرکب زینت کی شخصیت میں نظر آتا ہے۔

کبھی آپ ان کو بچوں سے گھوڑا جلدی چلو، جلدی چلو کھیلتے ہوئے دیکھیں گے۔ کبھی جوانی کا بھرپور عزم انھیں محرک کرتا ہوا نظر آئے گا اور کبھی بڑھاپے کی بصیرت ان کے مشوروں سے منعکس ہوتی نظر آئے گی اور ہر میدان میں حصول کمال ان کی کوششوں کا مدعا ہوگا۔ جب پکانے بیٹھیں گی تو آپ وہ اہتمام دیکھیں گے جو ماہر باورچی کو مات کر دے۔ جب لکھنے بیٹھیں گی تو مقبولیت و ہردل عزیزی یا شہرت حاصل کرنے کا خیال بھی پاس نہ پھٹکے گا۔ ہمہ تن اور ہمہ ذہن روح فکر و نظر کی گہرائی تک پہنچنے کی کوشش ہوگی۔ بات کریں گی سامعین ہمہ تن گوش ہو جائیں گے۔ نوک جھونک، بحث و تکرار میں بھی حق پسندی و حق گوئی مقصد ہوگی۔ جرأت و بے باکی، مصلحت اندیشی کو کوڑے کی ضرب لگائے گی۔ سچ ہمیشہ تلخ ہوتا ہے اور صداقت پر یقین کی شدت زینت کے لب و لہجہ کو بسا اوقات تلوار کی دھار بنا دے گی۔ ان کی اس صفت نے ان کے طویل تدریسی دور کو اور تصنیف و تالیف کے دور کو تلخ تجربوں سے بھر دیا ہے۔ اسی نے دور والوں کو اور دور کیا ہے وہ کبھی زہر کو قلا قند نہ کہہ سکیں اور نہ چوٹ کو مشال میں لپیٹا۔ اُن کا وار سیدھا اور ڈائرکٹ رہا۔

بعض انسانی کمزوریوں سے زینت بھی مستثنیٰ نہیں ہیں۔ دوست ہونے کے ناطے میں نے بھی چھلنی کی ہے مگر چھلنی میں جو اصل رہا اس کی مقدار چھنکے جانے والے بھوسے سے بہت بہت زیادہ ہے اور صرف اتنی بات ہی انھیں عام ہمعصروں میں طویل القامت بناتی ہے۔

پیاری زینت!

دلی دعائیں!

نظر یہ آپ کے دامن کا قرض ہے شاید
بڑے تپاک سے گلشن میں صبح و شام ملے

اپنی حالیہ غزل کا ایک شعر تمہاری نذر کر رہی ہوں زینت میں ٹھیک ٹھیک یہ تو نہیں بتا سکتی کہ تم سے کب اور کہاں ملاقات ہوئی تھی مگر اتنا ضرور بتا سکتی ہوں کہ اپنی پسند کے پھولوں کی خوشبوئیں نے ہمیشہ تمہاری نذر کی ہے اور اسی احساس کے ساتھ ہمیشہ تمہیں پڑھا ہے سُنا ہے دیکھا ہے اور محسوس کیا ہے۔ اس طرح میرے احساس پر ایک عرصہ دراز سے تمہارے دامن گوہربار کا قرض باقی تھا جس کو گونجتی آواز کے روپ میں لوٹا رہی ہوں قبول کرو تمہیں بہترین استاد کا ایوارڈ ملنے پر دیر سے سہی دلی مبارکباد پیش کرتی ہوں تمہارے جشن منانے کی اطلاع سے دل کھل اٹھا خدا تمہاری عمر دراز کرے آمین۔

برادر عزیز شاہد کو سلام بچوں کو دعائیں۔

مخلص

تمہاری

خورشید آپا

نوٹ :- میری صحت ٹھیک نہیں ہے اس مبارک موقع پر شرکت نہ کرسکوں تو مجھے معاف کرنا۔

امۃ الکریم خورشید نذیر

★

گونجتی آواز

(جشن زینت ساجدہ کے موقع پر)

صاف نیت میں دکن کے دلِ سرشار کے ساتھ
علم گاہوں کے عہد ساز گہربار کے ساتھ
تم چلی آئی ہو اس عظمتِ افکار کے ساتھ
دل نشیں طرزِ ادا شوخیٔ اظہار کے ساتھ

O

ساغرِ علم اچھالا ہے عبادت کی طرح
لوٹنے والوں میں حاتم کی سخاوت کی طرح
کتنے پیاسوں کو مئے علم کے پیمانے دیئے
علم و دانش کے مہکتے ہوئے میخانے دیئے
کتنے ذہنوں نے پڑھے ہیں دیوانوں کی طرح
ایک ایک لفظ کو تسبیح کے دانوں کی طرح
خانقاہوں کے در و بام کا اُجالا ہو تم
ان دریچوں میں سدا گونجتی آواز ہو تم

O

تم کو سب زینت ایوانِ ادب کہتے ہیں
آبروئے روتاباں کا سبب کہتے ہیں

ڈاکٹر زینت ساجدہ ایک فرد کا نہیں جامعہ عثمانیہ اور حیدرآباد کی تہذیب اور تمام علمی ادبی اور ثقافتی روایات کا نام ہے۔ ان کے بغیر حیدرآباد کی ادبی اور تہذیبی زندگی کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ اردو کی بالغ نظر نقاد ہیں۔ ممتاز اور صاحب طرز انشا پرداز ہیں، کئی علمی اور ادبی اداروں کی روح رواں ہیں، اردو کی ایک بلند پایہ اور مقبول و محبوب استاد ہیں سارا شہر اور ساری اردو دنیا ان کے نام اور کام سے واقف ہے۔ لیکن ــــ ڈاکٹر زینت ساجدہ اردو کی استاد، نقاد اور انشا پرداز بننے سے پہلے ایک افسانہ نگار تھیں اور آج بھی اردو کے مشہور اور ممتاز افسانہ نگاروں کی صفِ اول میں وہ ایک معتبر مقام رکھتی ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری کا آغاز اسکول کے زمانے میں ہوا۔ باضابطہ افسانہ نگاری کالج کے زمانے میں شروع ہوئی۔ بیس بائیس سال کی عمر میں یعنی مارچ ۱۹۴۷ء میں ان کے افسانوں کا مجموعہ "جل ترنگ" چھپ کر منظرِ عام پر آیا اور ایک باصلاحیت افسانہ نگار کی حیثیت سے وہ اردو دنیا میں مشہور ہو گئیں۔

"جل ترنگ" کے بعد ان کی افسانہ نگاری کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ ۱۹۴۷ء سے اب تک انھوں نے اپنے افسانوں سے اردو کے افسانوی ادب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ پچھلے چند سالوں سے وہ افسانہ نگاری پر

اکرام جاوید

ڈاکٹر زینت ساجدہ اور اُن کے افسانے

(ایک جائزہ)

بھرپور توجہ نہ دے سکیں۔ اور نثر کی دیگر اصناف پر ان کی توجہ رہی اس کے باوجود بحیثیت افسانہ نگار ان کا مقام بلند ہے اور رہے گا بھی!

ڈاکٹر زینت ساجدہ کے افسانوں اور ان کی افسانہ نگاری کا جائزہ لینے سے قبل ان کے ابتدائی عہد کو سمجھنا بے حد ضروری ہے۔ وہ مئی ۱۹۲۴ء کو ایک خوشحال متوسط گھرانے میں جو علم و فضل کے اعتبار سے بھی مشہور تھا اور مذہبی تقدس کے لحاظ سے بھی معزز تھا پیدا ہوئیں۔ یہ زمانہ جامعہ عثمانیہ اور اردو تہذیب اور کلچر کا عہد زریں تھا۔ ہند میں خلافت تحریک کے بعد آزادی کی جدوجہد کا آغاز ہو چکا تھا۔ "ہندوستان چھوڑ دو تحریک" اور ۱۹۴۲ء کی تاریخی سیتہ گرہ اور سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ علمی ادبی سرگرمیاں بھی زور و شور سے جاری تھیں۔ ۱۹۳۵ء کی ترقی پسند مصنفین کانفرنس کے بعد ملک بھر میں نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی نسل ادب میں ترقی پسند تحریک سے بے حد متاثر ہو چکی تھی اور حیدرآباد کے ادیبوں اور شاعروں نے بھی اس تحریک کا اثر قبول کیا۔ آزاد حیدرآباد کے تصور کی عملی صورت گری کے لئے حکومت وقت سرگرم عمل تھی ہر طرف ہلچل اور ہنگامے کا سا عالم تھا متوسط گھرانوں میں تعلیم نسواں کی تحریک چل پڑی تھی لیکن ماحول سخت مذہبی تھا عورتیں سخت پردہ کرتی تھیں۔ خواتین کی دنیا گھر، اسکول اور کالج کی چار دیواری تک محدود تھی۔ مردوں کی محفلوں میں شرکت تو در کنار کسی غیر محرم سے بات تک کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ تعلیم یافتہ لڑکیاں

زنانی اسکولوں اور زنانہ کالج کی سرگرمیوں میں حصہ لے سکتی تھیں۔ صرف چچا زاد، ماموں زاد، خالہ زاد بھائیوں، سہیلیوں اور بھابیوں کے بھائیوں سے مل سکتی تھیں اور بات کر سکتی تھیں۔ اس لیے اس دور کے افسانوں کے ہیرو بھی چچا زاد، ماموں زاد قسم کے بھائی یا بھاوجوں کے بھائی ہوا کرتے تھے۔ محبت دلوں میں چنگاری کی طرح سلگتی رہتی تھی عود و عنبر کی طرح دل جلا کرتے تھے مگر دھواں کبھی کبھی اٹھتا تھا۔ حرفِ تمنا کبھی لب پر نہیں آ سکتا تھا خاموش محبت کے صدہزار افسانے دل کی بربادی پر ختم ہو جاتے تھے۔ عشقِ مجازی کی کوئی قدر نہ تھی۔ لوگ عشقِ حقیقی کے عنوان سے جی کی بھڑاس نکال لیا کرتے تھے۔ شخصی حکمرانی کا دور تھا اظہارِ خیال کی آزادی آج کی طرح نہ تھی۔ اس لیے شاعری ہو یا افسانہ نگاری زلف و رخ کی حکایات سے بات آگے نہ بڑھ سکتی تھی کاچی گوڑہ اسکول سے میٹرک، زنانہ کالج سے بی اے اور آرٹس کالج عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم کیا اور زنانہ کالج میں لیکچرار ہوئیں۔ اس زمانے کی مشہور خاتون افسانہ نگار رجان بانو نقوی ان کی استاد بھی تھیں اور افسانہ نگاری کے شوق کو ابھارنے کی ذمہ دار بھی۔

"جل ترنگ" میں میرے افسانے" کے عنوان سے زینت ساجدہ نے اپنے اور مجموعے میں شامل افسانوں کے بارے میں ایک مختصر سا دیباچہ لکھا ہے، جس کے اقتباسات درج ذیل ہیں:

"میں بچپن سے کہانیاں سننے کی شوقین ہوں۔ بوڑھوں سے میری کافی دوستی رہی ہے۔ اس لئے کہ وہ کہانیاں کہتے تھے۔ بعد میں ہر ایک سے کچھ نہ کچھ اپنی پرائی زندگی کے حالات سننے کا شوق ہو گیا۔"

"اسکول کے زمانے سے میری بیماریوں کی ابتدا ہوئی اور آج تک رسم دوستی نباہ رہی ہوں۔ جب میرا جسم تکلیف کی شدت سے بے چین رہتا اور روح بھی گھبرایا کرتی تو میں نے اس حالت سے فرار کی ایک صورت نکالی اور وہ یہ کہ میں ان کہانیوں کے متعلق سوچتی رہتی جو لوگوں نے اپنی یا کسی اور کی زندگی کے متعلق سنائی تھیں۔ کہانی کے سارے پہلو اسی دوران میں روشن ہو جاتے اور میں اس کے خطوط کو اپنے ذہن میں واضح کر لیتی۔ اور جب موقع ملتا اور میرا جی چاہتا لکھ لیتی۔"

"لکھنے کے لئے مجھے برسات کی شام بہت پسند ہے۔ دھندلی دھندلی شام ہو، فضا میں ٹھنڈک ہو اور بارش کی بوندیں کھڑکیوں کے شیشوں پر جل ترنگ بجاتی رہیں۔ یہی ٹھنڈا ترنم میرے افسانوں میں سمویا جاتا ہے"

اس پس منظر میں جل ترنگ کے افسانوں کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے:

"جل ترنگ" کی ساری کہانیاں سچی ہیں۔ صرف افسانوی مبالغے سے میں نے کام لیا ہے۔ ان کہانیوں کے سارے کردار زندہ موجود ہیں۔"

"یہ سب افسانے تجربے تھے۔ سوائے "بی بی" کے میں کسی سے بالکل مطمئن نہیں ہوں۔ لیکن اب "ارشی" لکھنے کے بعد میں نے محسوس کیا ہے کہ میں آگے بڑھ رہی ہوں   ۔ اس لیے میں نے "ارشی" کو اس مجموعے میں شامل نہیں کیا۔"

"جل ترنگ" میں حسب ذیل افسانے شامل ہیں:

(۱) پروانے (۲) کھلاڑی (۳) بی بی (۴) کنول رانی (۵) یونیورسٹی روڈ پر (۶) شہزادی

(۷) مذاق (۸) پارہ (۹) بجھتا ہوا شعلہ (۱۰) آخری لمحہ

"پروانے" انھوں نے کالج کے زمانے میں لکھا تھا اور یہ افسانہ بمبئی سے نشر بھی ہوا۔ زبان و بیان انشاپردازی کو اتفاق

بہاؤ اور وحدتِ تاثر کے اعتبار سے ان کا پہلا افسانہ اب بھی دل و دماغ کو متاثر کرتا ہے۔ فاروق کی نارسائی اور ہیروئن کی نامراد محبت کا المناک انجام اس دَور کے سماج اور روایات پر گہرا طنز بھی ہے اور خاموش احتجاج بھی۔

"کھلاڑی" "مذاق" "کنول رانی" "پارو" "بجھتا ہوا شعلہ" "آخری لمحہ" زبان و بیان و منظر کشی، درسرا پا نگاری اور سب سے بڑھ کر سادگی اور سچائی کے اعتبار سے جامد روایات افسانہ نگاری سے مختلف اور انفرادی تخلیقی اہمیت کے افسانے ہیں۔ اس دور کے ہم عصر افسانہ نگاروں کی تخلیقات کے تقابلی مطالعے سے ان افسانوں کی خوبی اور معیار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ خود افسانہ نگار ان افسانوں سے مطمئن نہیں ہے لیکن افسانوں کا ایک باشعور قاری اس عہد کے پس منظر میں ان افسانوں کو پڑھ کر مطمئن ہو سکتا ہے۔ "بی بی" اس افسانوی مجموعے کا سب سے اچھا اور ہر اعتبار سے مکمل معیاری افسانہ ہے۔ مجھے تو یہ افسانہ اس لئے بھی پسند آیا کہ اس کا ماحول اور فضا وہی ہے جس کا بچپن میں میں نے بھی مشاہدہ کیا ہے۔ خاموش محبت کا ایک پُر تاثر افسانہ اپنے منفرد اور ہمیشہ یاد رکھے جانے والے کردار "بی بی" کی بدولت اردو کے بہترین افسانوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

"شہزادی" اس مجموعہ کا ایک اور کامیاب افسانہ ہے۔ شہزادی کا کردار عجیب ضرور ہے مگر غیر فطری ہرگز نہیں۔ واقعات نگاری اور نفسیاتی تجزیے کے علاوہ زبان و بیان اور تاثر کے اعتبار سے بھی افسانہ اہم اور خوبصورت ہے۔

"جل ترنگ" کے افسانے اپنے زمانے کے سماج اور خاندانی زندگی کی حقیقی ترجمانی کرتے ہیں۔ تصنع اور ریا سے پاک صاف ان افسانوں سے ڈاکٹر زینت ساجدہ کی بہترین صلاحیتوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ان افسانوں میں رومان پرستی ایک قدرِ مشترک ہے غم اور شائستہ اظہارِ جمال ان کا بنیادی وصف ہے۔

"جل ترنگ" کے افسانوں کے بعد اسی سال ۱۹۴۴ء کے زمانے میں لکھے گئے افسانے "ارشی" سے ڈاکٹر زینت ساجدہ کی افسانہ نگاری کے ایک نئے دَور کا آغاز ہوتا ہے۔ مزاج کے اعتبار سے ڈاکٹر زینت ساجدہ رومان پسند ہیں۔ شدتِ احساس، گہری واقفیت اور مہذب شائستہ جذبۂ دل، سماجی اور فنی بصیرت ان کے دوسرے دَور کے افسانوں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

افسانہ "ارشی" کا ماحول اور موضوع "بجھتا ہوا شعلہ" سے بڑی حد تک ملتا جلتا ہے۔ مجھے لگتا ہے جیسے افسانہ "بجھتا ہوا شعلہ" کا خاموش، کم زور اور شرمیلا اور محروم تمنا ہیرو "ارشی" کی صورت میں ایک نڈر، بے باک، بے پروا اور حرکیاتی کردار بن کر ابھرا ہے اور اپنی شکست فاتحانہ سے افسانوی ادب کا ایک لافانی کردار بن گیا ہے۔ اس افسانے میں جگہ جگہ قدیم اور جدید کا تصادم بھی ہے، اور ترقی پسند خیالات کی تحریک بھی۔ محبت کے بارے میں افسانہ نگار کے نقطۂ نظر میں واضح تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔ جواد [illegible] اور ہیروئن جو افسانے کا واحد متکلم کردار ہے "ارشی" کے کردار کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالتے اور [illegible] مرکزی اہمیت کا حامل بنا دیتے ہیں۔ خاندانی زندگی کی حقیقی عکاسی اور "ارشی" کی کردار نگاری سے ڈاکٹر زینت ساجدہ کے فن کو ایک نئی سمت ملی ہے۔ اور افسانہ "ارشی" اردو کا ایک اہم اور بہترین افسانہ بن گیا ہے۔

افسانہ "زنجیریں" ڈاکٹر زینت ساجدہ کے دہنی نقطۂ نظر اور سماجی شعور کی خوبصورت ترجمانی کرتا ہے۔ صنم اور اس کے ترقی پسند خیالات، قائم جنگ کی بیٹی جو صنم کی بھابی ہے اور اس کے بچے کی ماں، صنم کے پاؤں کی زنجیریں بن جاتی ہے۔ کوشش کے باوجود وہ ان زنجیروں کو توڑ نہیں سکتا اور اپنے آپ سے ہار جاتا ہے۔ واقعات میں منطقی ربط اور فطری بہاؤ کے باوصف ایک طرح کا بھاری پن آ گیا ہے جس کی وجہ افسانہ کی فضا اور تاثر قدرے مجروح ہو گئے ہیں پھر بھی "زنجیریں" ایک اچھا افسانہ ہے۔

"جھنگو میرا بھائی" ہلکے پھلکے مزاحیہ رنگ کا افسانہ ہے

"اوتار" کو میں ڈاکٹر زینت ساجدہ کا ایک بے حد اہم اور کامیاب افسانہ سمجھتا ہوں۔ اس افسانے میں مرکزی کردار ہیروئن منی کا ہے جس کی زبانی کہانی بیان ہوتی ہے۔ "اوتار" "نورانی" "علی جان" "عائشہ خانم" اور نورانی کی بیوی اس افسانے کے ذیلی کردار ہیں۔ منی کے کردار کے آئینے میں جگہ جگہ خود افسانہ نگار کی شخصیت، خیالات، جذبات اور احساسات کا عکس بھی دکھائی دیتا ہے۔ "اوتار" کی ہیروئن منی کے جذبات اور احساسات ملاحظہ ہوں۔

"اس دن میرا دل سخت بے چین تھا۔ کیونکہ آخر میرے تصور کی دنیا اتنی اونچی، اتنی کومل، اتنی انمول ہے کہ اس میں کوئی بہت دنوں تک زندہ بھی نہیں رہ سکتا۔ کوئی اس کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ کیا وہ آدمی پیدا نہیں ہوا جو میرا ساتھی بنے؟ لاکھوں طوفان آئے اور گزر گئے۔ مگر لوگ کہتے ہیں میں خشک ہوں۔ بد دماغ۔ زمین پر رہتے ہوئے آسمانوں کی باتیں کرتی ہوں۔ میں یوں ہی ستاروں کی چھاؤں میں بادلوں کے دوش پر اڑتی رہوں گی، اڑتی رہوں گی۔ یہاں تک کہ ایک دن تصور کا غبارہ پھٹ جائے گا" میرے پاؤں زمین کو چھو لیں گے۔ اور میں دیکھوں گی کہ زندگی کا دن ڈھل گیا اور شام ہوا چاہتی ہے؟

افسانے میں "اوتار" ایک دبلا پتلا نازک اور لمبا سا تیکھے اور کٹے نقش کا پرکشش جوان آدمی ہے۔ ایک با اثر اعلیٰ عہدہ دار علی جان کی معتمد سے ہنگم بہن عائشہ خانم کا شوہر ہے۔ منی کے بھائی نورانی کا دوست ہے۔ وہ ایک با ذوق اور مہذب آدمی ہے۔ علم و ادب کا دلدادہ ہے۔ منی اوتار کو اپنا آدمی سمجھتی ہے۔ دل و جان سے اس کی پرستش کرتی ہے۔ مونگ پھلی شکر وغیرہ کے پرمٹ کے حصول کی خاطر نورانی اوتار کو گھیرے ہوئے ہے اور ایک دن شادی شدہ مرد سے ستائیس سالہ کنواری لڑکی منی کی رومانی وابستگی ایک نظارے سے ٹوٹ جاتی ہے۔ سب موتی ایک ایک کر کے بکھر جاتے ہیں خوابوں کا حقائق سے یہ ٹکراؤ گہرا تاثر پیدا کرتا ہے۔ افسانے میں ایک ہارتی ٹھہراؤ ہے۔ جذبات کے اظہار میں کہیں بھی غلو نہیں پایا جاتا ہے۔ گہری داخلیت اور رومانیت اس افسانے کو ایک بہترین افسانہ بناتے ہیں!

ڈاکٹر زینت ساجدہ کا سب سے اہم اور نمائندہ افسانہ "کیا وقت ہے" بحیثیت افسانہ نگار ان کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔ سرسری طور پر پڑھنے والوں کو یہ افسانہ ایک "انشائیہ" معلوم ہو سکتا ہے لیکن یہ افسانہ ہے جو جدیدیت اور داخلیت پسند رجحان کی نمائندگی بھی کرتا ہے۔ کامو کے افسانے "باہر والا" ([illegible]) کے مرکزی کردار کی طرح ڈاکٹر زینت ساجدہ کے اس افسانے کے کردار ایک بوڑھا اور ایک بڑھیا، پیشے تاریخ سے بے نیاز وقت کے سیلِ رواں میں بہے جا رہے ہیں۔ اور گرد کے ماحول [illegible] پیچھے پھرتا اور بے جا تو ہے۔

"وقت کی چپ چاپ مشین انھیں دھیرے دھیرے گھس رہی ہے۔ تنہائی انھیں دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے کھوکھلا کر رہی ہے۔ کیا وقت ہے؟ کیا وقت ہوگا؟ یہ وقت آخر کب گزرے گا؟"

ڈاکٹر زینت ساجدہ کا یہ افسانہ ۱۹۴۷ء سے قبل کے افسانوں کا دور کو ۱۹۶۰ء کے بعد سے شروع ہونے والے موجودہ دور سے جوڑ کرتا ہے اور قدیم و جدید کے بے معنی جھگڑے کو ختم کرتا ہے۔

ڈاکٹر زینت ساجدہ کا مطالعہ وسیع ہے، مشاہدہ گہرا، افسانہ نگاری کے لئے درکار "تجربات اور شدتِ احساس" کی ان کے ہاں کمی نہیں۔ زبان و بیان پر انھیں کامل قدرت حاصل ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اپنی افتادِ طبع اور [illegible] کے اعتبار سے ایک [illegible]

بقیہ صفحہ [illegible]

ڈاکٹر نامرہ فضل اللہ

زندگی کی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں پہ ذرا سا ستانے کے لئے رکتے ہیں تو مل مل کر بچھڑتے اور بچھڑ بچھڑ کر ملنے والی کئی شخصیتوں کی یاد آجاتی ہے۔ کسی کسی شخصیت کی یاد کے ساتھ دل یہ چاہتا ہے کہ اس نام کے ساتھ ہمارا نام بھی وابستہ رہے۔ میری زندگی میں ایسی ہی ایک شخصیت زینت آپا کی بھی ہے۔ اور جب مجھ سے یہ فرمائش کی گئی کہ ان کی شخصیت کے اس پہلو پر خامہ فرسائی کروں، جسے اُستاد کے بلند مرتبت نام سے پکارا جاتا ہے، تو میں نے محسوس کیا کہ مجھے منہ مانگی مُراد مل گئی۔ زینت آپا کے کئی نامور شاگرد ہیں لیکن مجھ جیسی غیر معروف شخصیت کو ان کی شخصیت کے اس پہلو کو اُجاگر کرنے کی دعوت دے کر مجھے دو انعام دے دیئے گئے۔ پہلا تو یہی کہ زینت ساجدہ اور نامرہ کو ایک وابستگی عطا کر دی گئی۔ دوسرا یہ کہ وابستگی شخصیت کے اس پہلو سے پیدا کر دی گئی جس سے مجھے والہانہ وارفتگی رہی ہے۔ نوخیز الھڑ پن نے چھیڑ کا مجھے سامنا نہ تھا ۔ نداعیر رفتہ کو آواز دینا

۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۲ء تک مجھے زینت آپا کی شاگردی کا فخر حاصل رہا۔ ۱۹۴۹ء میں کلیہ اناث کی انٹرمیڈیٹ کلاس میں داخلہ لیا اور ۱۹۵۲ء میں وہاں سے بی۔ اے کامیاب کیا۔ یہ دور زنانہ کالج کی تاریخ میں اس لئے بھی اہم ہے کہ اس دور میں زنانہ کالج ریذیڈنسی کی عمارت میں منتقل ہوا تھا۔ ریذیڈنسی کا قدآدم آئینوں سے سجا ہوا دربار ہال اپنے اسپرنگ دار چوبی فرش اور بلوریں فانوس کے لئے مشہور تھا۔ دربار ہال کے وسیع اور پرشکوہ برآمدے کی سیڑھیوں سے پرے ایک چھوٹا سا خوبصورت باغیچہ تھا، جو نفیس اطالین گھاس کے سرسبز لان اور رنگ برنگے گلابوں سے نظر نواز ہوا کرتا تھا۔ اس باغ میں فوارہ بھی تھا اور ایک پتھر کی مستطیل سیٹ جس پر بیلیں چڑھائی گئی تھیں یہ حصہ اپنے ماحول کی وجہ سے پرسکون بن گیا تھا۔ ریذیڈنسی کی وسیع عمارتوں اور احاطے کے حصے بخرے نہیں ہوئے تھے اور نہ اس کا دلو صیل پھاٹک اس سے منقطع ہوا تھا۔ انتہائی وسیع

احاطہ لمبی لمبی قلعہ نما دیواریں، دور دور تک پھیلے ہوئے سبز دوب کے لان، دیو ہیکل پھاٹک کے قریب ایک چھوٹی سی چٹان ، تناور سایہ دار پیڑوں کے درمیان گھری ہوئی خوبصورت عمارت ایک طرف رذیڈنسی کے عملے کا پاک صاف چھوٹا سا قبرستان' اس سے متصل ایک اور پردہ دار قسم کا باغ جس کے چھوٹے چھوٹے مستطیل حوضوں میں کنول کے پھول کھلا کرتے تھے یہ تھا بیگمس گارڈن جو ایک انگریز ریذیڈنٹ کی مسلمان بیگم خیرالنساء کی یاد تازہ کرتا تھا۔ ریذیڈنسی کے ایک کمرے میں خیرالنساء بیگم اور کرک پیٹرک کے بچوں کی خوبصورت تصویر تھی۔ دونچے گول مٹول سے انگریزی لباس پہنے ہوئے ۔ (بعد میں کہیں پڑھا تھا کہ مشہور انگریز مفکر مصنف کارلائل انہیں میں سے کسی بچے کی ذریت میں سے تھا۔ پتہ نہیں اس میں کتنی اصلیت ہے) ریذیڈنسی کی دوسری منزل بھی بڑی شاندار تھی۔ نیم دائرہ چکر دار زینوں کی دیواروں پر انگریز ریذیڈنٹوں کی تصویریں آویزاں تھیں۔ جس جگہ نیم دائرہ دونوں زینوں کی سیڑھیاں اگلی منزل پر جانے کا پہلا موڑ جن کر ختم ہوتی تھیں، اسے شاندہ چبوترے کی شکل دے دی گئی تھی اور اسے ایک قدآدم گھڑی سے سجایا گیا تھا۔ (جو اب وہاں نہیں رہی) ۔

زینوں کے اختتام پر دوسری منزل میں داخل ہوتے ہی دربار ہال کے اوپر کی گیلری تھی۔ مستطیل گیلری دربار ہال کی تقاریب کے نظارے کے لئے بنائی گئی ہوگی۔ اس گیلری میں ایک جانب اونچے اونچے دریچے بنے ہوئے تھے، جہاں سے دربار ہال کے سامنے والے خوبصورت باغ کا نظارہ بھی کیا جا [illegible] مستطیل گیلری کی دائیں جانب ایک نیم دائرہ نیم روشن [illegible] دروازہ ایک بالکنی میں کھلتا تھا۔ آم کے [illegible] پیڑوں کا سایہ اس پر پڑتا تھا اور گرمیوں کے اوائل میں کالج بند ہونے سے قبل آم کے بور سے مہکا کرتا تھا۔ یہی تھی ہماری اُردو کی کلاس ۔ اس سے قریب ایک اور روشن ہوا دار چوبی فرش کا بڑے بڑے دریچوں والا کمرہ تھا، جس کے ایک دریچے سے دربار ہال کے سامنے کا پرشکوہ برآمدہ نظر آتا تھا تو ایک جانب سے برآمدے کے سامنے والا باغیچہ اور ایک جانب سے وہ پھاٹک جو اس وسیع عمارت کے دوسرے دروازے کی رہگزر اور اس عمارت کو جُدا کرتا ۔ یہیں ہمارے فلسفے کی کلاس تھی ۔

میرے مضامین انٹرمیڈیٹ اور بی۔ اے میں اُردو، فارسی اور فلسفہ تھے ۔ ان دنوں انٹرمیڈیٹ کے ۲ سال اور بی۔ اے کے دو سال ہوا کرتے تھے ۔

ایک طرف اس طبعی ماحول کا طلسم ، اس کی طراوت اور رعنائی، کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست کی منہ بولتی تصویر تھی، تو دوسرے طرف قابل اساتذہ کی علمیت ، اپنائیت خوش خلقی، ہمارے ذہنوں کو آفاقیت سے روشناس کیا کرتی ۔ ہمارے اساتذہ میں ہر ایک اپنی مثال آپ تھا۔ بانو آپا ۔ (جہاں بانو نقوی مرحومہ) قمر آپا، (قمرالنساء بیگم عباسی) رضیہ آپا (ڈاکٹر رضیہ اکبر) رفیعہ آپا، (ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ) زینت آپا (ڈاکٹر زینت ساجدہ) مس بھروچہ، حبیبہ حبیب الرحمٰن، افسر آپا مس پوتھن، مس چناپے، مس شیریں شراف۔ ان سے تو شرف تدریس بھی رہا ۔ ان کے علاوہ اور کئی قابل اساتذہ اس درسگاہ کی زینت تھیں، جن میں سلامت آپا مرحومہ، زبیدہ یزدانی، حمائز آپا مسز گیس (جن کی دو پوتیوں نے انڈین پولیس سروس میں حال میں نمایاں کامیابی حاصل کی) کئی شخصیتیں ناقابل فراموش ہیں چند سال بعد مس ریگانی، مس گروالی، مسز وید یمی، مس کمار، شہنشاہ آپا، طیبہ آپا، کنیز آپا، مہر آپا، سے بھی اساتذہ کی

حیثیت سے تعارف ہوا۔ یہ تو آرٹس کے مضامین پڑھانے والے اساتذہ تھے۔ سائنس کے بھی کئی لکچرر تھے، جن میں اکثروں کے نام اور صورتیں ذہن میں رہ گئیں لیکن سوائے دو ایک کے کسی سے شخصی طور پر تعارف نہ تھا۔

کالج میں ہر مضمون کے ساتھی الگ الگ تھے فلسفہ اور فارسی میں بہت کم لڑکیاں تھیں۔ اس لئے آج بھی سب کی سب یاد ہیں۔ آمنہ مینائی، سراج سید علی، انور برنی، خالدہ قاضی حبیب میاں خاں، حمید جلیل، صغورا، حُسنہ، مُبین مسعود، خدیجہ نثار، یہ سب ساتھی اردو میں بھی شریک درس رہا کرتیں ان کے علاوہ اردو لینے والوں میں وہ لڑکیاں جو زینت آپا کی حیات میں برابر کی شریک تھیں، فردوسی، افتخار، نسیم فاطمہ اور اردو کی زود نویس ناول نگار عفت موہانی قابل ذکر ہیں۔ ترقی پسند ادب کے پسند کرنے والوں کا ایک علیٰحدہ گروپ تھا۔ اس گروپ میں بھی اکثر لڑکیاں زینت آپا کی بے حد مداح تھیں۔ ان سب کے نام لکھنے بیٹھوں تو مضمون غیر ضروری طور پر طوالت اختیار کرتا جائے گا۔

ہم سے سینیر اور جونیر طالبات میں بھی اکثر زینت آپا کو پسند کرنے والیاں ہم سے بے حد قریب تھیں۔ ان میں مبین مسعود کی بہن مفیض مسعود کا نام سرفہرست ہے۔ اس کے علاوہ چند اور لڑکیاں جو زینت آپا کو بے حد پسند کرتی تھیں ان میں دو ساجدہ علی تھیں اور ایک طیبہ بلگرامی۔

میری مجھلی بہن شاکرہ بیگم بی۔ اے میں پڑھتی تھیں ان کے مضامین فلسفہ، اردو اور تاریخ تھے۔ اس لئے ان کے اساتذہ بھی اردو اور فلسفے کی حد تک وہی تھے جو ہمارے تھے۔ ہم دونوں گھر آنے کے بعد گھنٹوں کالج کی باتیں کیا کرتیں۔ اساتذہ میں بانو آپا، قمر آپا، اور زینت آپا کا تذکرہ ان باتوں کی جان ہوا کرتا تھا۔ میری بہن شاکرہ، رضیہ آپا کی شاگرد بھی تھیں، لیکن صفورہ (جنہیں اب حزن و ملال کے ساتھ مرحومہ کہنا پڑتا ہے) اور حسنہ جو میری رشتے کی بہن بھی ہیں، ان کی ساتھیوں میں عزیزہ، رضیہ آپا کی اکلوتی کے نام سے مشہور تھیں۔ شریف النساء انصاری بھی غالباً پچھلے کے بیاچ میں فارسی کی تنہا طالب علم تھیں۔ اس لئے ہماری گفتگو میں رضیہ آپا کا بھی تذکرہ ہوتا تھا۔ کالج کے علاوہ خاندان کی جس کسی بھی محفل میں ان لوگوں سے ملاقات ہوتی یہی چرچے رہا کرتے ہم تینوں میں سے اگر کوئی ایک دن بھی غیر حاضر رہتا تو کالج جانے والی ساتھی اس دن کی ساری روداد دوسرے دن سنایا کرتی۔ اور اگر ضرورت ہو تو خط کے ذریعہ سارے حالات غیر حاضر ہونے والی ساتھی کو لکھ کر بھیجا کرتی۔ ان میں سے بعض خطوط ہمارے خاندانی رسالہ مشیر النسواں میں بھی شائع ہوئے ہیں۔ ایک خط میں صفورہ مرحومہ نے مجھے مخاطب کیا تھا "ز" کی بچی۔ ز سے مراد زینت آپا تھیں۔ مطلب یہ کہ زینت آپا کی میں گویا منہ بولی بیٹی تھی، ہم تینوں فارسی کی طالب علم ہونے کی وجہ سے رضیہ آپا کی بھی بے حد مداح تھیں۔

ان تذکروں کے متعلق ایک واقعہ قابل ذکر ہے میرا ڈیڑھ سالہ بھانجہ خالد وہاب، جو اب ماشاء اللہ سعودی عرب میں انجنیئر ہے، کبھی خاندانی تقریب میں رات میں سوتے سوتے اُٹھ بیٹھا اور محفل میں زور زور سے ہونے والی باتوں کے متعلق دریافت کرنے لگا۔ کہ کیا یہ لوگ لڑ رہے ہیں؟ جب کہا گیا کہ نہیں باتیں کر رہے ہیں، تو اس نے اشتیاق سے پوچھا کیا زینت آپا کی باتیں کر رہے ہیں؟" اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی خالاؤں نے کس انداز سے ان کا تذکرہ کیا ہوگا!

کالج کے ساتھیوں میں میں اور آمنہ مینائی زینت آپا کو دیوانہ وار چاہتی تھیں۔ اگر ہم کو گمان بھی ہوتا کہ کالج یا کالج سے باہر کوئی ان کے متعلق بری رائے رکھتا ہے تو ہم کو بے حد ناگوار ہوتا اور ہم کسی نہ کسی طرح زینت آپا کی برتری تسلیم کروانے کے لیئے تیار ہو جاتیں۔ کسی دن زینت آپا کالج نہ آتیں تو ہمارا ذرا بھی دل نہیں لگتا اور ہم یہ سوچتے کہ ہم جیسے چاہنے والوں کے انتظار کی ذرا بھی انہیں پرواہ نہ ہوگی۔ وہ جب بھی ہمارے سامنے سے گزرتیں، ہماری نگاہیں ان پر سے ہٹتی ہی نہ تھیں۔ یہاں تک کہ وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو جائیں۔ اس موقع پر سراج سید علی ایک شعر سنایا کرتی ....

حسرت نہراتے رہ گیا آنچل
رنگ بن کر بکھر گیا کوئی

جب ہم انٹر کے دوسرے سال میں پہونچے تو مفیض مسعود کالج میں شریک ہوئیں۔ یہ بھی ہماری ہی طرح زینت آپا کی دیوانی تھیں۔ فری گھنٹوں میں ہم لوگ یا تو کالج کے ورانڈے، یا اس کے مقابل کے باغیچے یا دوسری منزل کی بالکنیوں سے اسٹاف روم میں یا دوسری کلاسوں میں مصروف زینت آپا کا نظارہ کیا کرتیں۔ کبھی کبھی ہم لوگ زینت آپا کے گھر بھی جاتیں۔ ایسے موقعوں پر زینت آپا سے جو گفتگو ہوتی اس کو بھی میں نے ہمارے عشیرے کے قلمی رسالے مشیر النسواں میں محفوظ کر دیا ہے۔ ان میں سے ایک مضمون کا عنوان تھا "گھرداری"۔ مفیض اپنے گھر کے کاروبار سنبھالے ہوئی تھی۔ زینت آپا نے اس کے متعلق مفیض سے گفتگو کی تھی۔ یہ مضمون ہمارے عشیرے کے حلقے میں کافی قبول ہوا تھا۔

اگر ورڈ [illegible] کسی شادی کی تقریب یا کسی محفل میں زینت آپا سے اچانک ملاقات ہو جاتی اور ان سے دو تین منٹ ہی کی رسمی گفتگو بھی ہو جاتی تو ایسا محسوس ہوتا کہ دل کا کنول کھل سا گیا ہے۔

اس زمانے میں ممتاز شیریں کا ایک افسانہ 'انگڑائی' اردو کے دلچسپ افسانوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس افسانے کو اس کے زبان و بیان کے حسن کی وجہ سے ہم نے کئی بار پڑھا تھا۔ آمینہ مینائی جو خود بے حد اچھی تحریر کی مالک تھیں، اس افسانے کی بڑی مداح تھیں۔ یہ ایک ایسی لڑکی کی کہانی تھی، جس نے اسکول کی ٹیچر یا کالج کی لیکچرار کو ٹوٹ کر چاہا تھا۔ اس کی تعلیم ختم ہو چکی تھی، گرمیوں کی چھٹیوں میں اس کی چھوٹی بہن اس کو بتاتی ہے کہ وہ ٹیچر ان کے گھر کی طرف آرہی ہیں۔ افسانہ اس لڑکی کی سوچ کے اطراف بنا گیا ہے۔ لڑکی اپنی اس وارفتگی کو یاد کرتی ہے، جو اس کو ٹیچر کے ساتھ تھی۔ اس کو ایک ایک بات کی یاد آتی ہے۔ اچانک اس کی سوچ کا رخ اپنے منگیتر کی جانب مڑ جاتا ہے اور اس کو وہ ساری ستم آرائیاں بھی یاد آتی ہیں جو اس ٹیچر سے وابستہ تھیں۔ اپنی وفائیں ان کی جفائیں۔ کلائمکس پر پہنچ کر اس کے دل میں ٹیچر کو ان جفاؤں کی سزا دینے کا خیال آتا ہے۔ جلدی سے وہ اپنے منگیتر کی لائی ہوئی ساڑی پہن کر اور اس کی فوٹو ہاتھ میں لے کر ڈرائنگ روم میں جاتی ہے، جہاں ٹیچر بٹھائی گئی ہیں۔

پتہ نہیں آمینہ مینائی پر کیوں ایک مرتبہ دھن سوار ہوئی تھی کہ انہوں نے نسیم، افتخار، فردوسی، مفیض اور مجھ سے جب کہ ہم سب بیٹھی زینت آپا کی باتیں کر رہی تھیں، کہا کہ ہم سب زینت آپا پر انگڑائی جیسی کہانی لکھو لیکن انگڑائی کے نصف آخر کا حصہ ہم سے غیر متعلق ہوگا۔

گزشتہ سال مکمل سورج گہن کے متعلق ایک انگریزی پمفلٹ کا اردو میں ترجمہ کر رہی تھی کہ اچانک ایک خاتون ایک لڑکی کے ساتھ میرے سامنے آکھڑی ہوئیں۔ میں نے مطلق

نہ پہچانا۔ وہ بڑبڑائیں۔ ان کے پیچھے ایک شریف آدمی کھڑا تھا اور برابر ایک لڑکی۔ ان سے مخاطب ہو کر کہنے لگیں۔ لو ابھی تک پہچان نہ پائیں۔ ارے آمنہ! میری آمنہ! پھر ہم دونوں بے اختیار ہو کریس۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی میں، جو میرا آفس ہے۔ ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ ہمارے ساتھی ہمیں حیران نظروں سے دیکھ رہے تھے تقریباً ۲۰ سال کے بعد میں نے آمنہ کو دیکھا تھا۔ وہ اب کراچی میں سرسید گرلز کالج کی پرنسپل ہیں۔ تذکرہ تو سورج گہن کا تھا مگر مجھے تو ایسا لگا کہ مسرت وشادمانی کا اجالا ہی اجالا پھیلا ہوا ہے۔ پہلی بار میں نے آمنہ کے شوہر کمال محمود (مشہور موسیقار طلعت محمود کے بھائی) کو دیکھا۔ آمنہ کی سب سے چھوٹی لڑکی زینب، جو اب کالج کی طالبہ بننے والی تھی، میرے سامنے تھی۔ کمال محمود، آمنہ اور خود میں عمر کی اس منزل میں پہونچ چکے ہیں جب "عمر کا سورج" سیاہ بالوں کو چاندی دے جاتا ہے اور اس کے باوجود آمنہ نے اور میں نے یہی محسوس کیا کہ ہم اب بھی زینت آپا کو اسی طرح چاہتے ہیں، جس طرح کہ آج سے بیس سال قبل انہیں چاہا تھا۔ اقبال نے ایک قاید کی صفات یہ گنوائی ہیں ؎

نگہہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لئے

استاد کا رتبہ کلاس میں میر کارواں کا سا ہوتا ہے لیکن بہت کم اساتذہ اس رخت سفر سے لیس ہوتے ہیں۔ زینت آپا کی انہیں خصوصیات نے ہم کو ان کا گرویدہ بنا دیا تھا جب خود پیشۂ تدریس سے وابستہ ہوئے تو یہی کوشش کی کہ ان جیسا استاد بن سکیں۔

کالجوں میں ہر گھنٹے کے بعد طالب علموں کو دوسرے کلاس روم کا رخ کرنا پڑتا ہے۔ ابتدائی چند دنوں سیٹ کیلئے دوڑ دھوپ ہوا کرتی ہے۔ چند دنوں بعد خود بہ خود کلاس میں بیٹھنے کا ایک مخصوص ڈھنگ (PATRON) بن جاتا ہے۔ ہر طالب علم کی ایک جگہ مخصوص ہو جاتی ہے۔ کچھ ہمیشہ سامنے بیٹھتے ہیں اور کچھ ہمیشہ پیچھے، کچھ درمیانی سیٹوں پر لیکن یہاں بھی کوئی دائیں طرف بیٹھتا ہے تو کوئی بائیں طرف۔ پچھلی سیٹوں پر بیٹھنے والوں کے لئے استعمال ہونے والی اصطلاح دوسرے موقعوں پر بھی استعمال ہوتی ہے یعنی بیک بنچرز۔

فارسی اور فلسفہ میں صرف ایک ہی قطار ہوتی تھی۔ اس لئے آگے پیچھے کا جھگڑا نہ تھا۔ البتہ دائیں اور بائیں نشستیں مخصوص ہوتی تھیں۔ اردو میں ہم اور ہمارے ساتھی درمیانی قطاروں میں بیٹھتے تھے۔ زینت آپا کی کلاس میں بھی ہم لوگ دوسری یا تیسری قطار میں بیٹھا کرتے تھے۔ زینت آپا کلاس میں آنے کے بعد جب اپنی کرسی پر بیٹھتیں تو پہلے پوری کلاس پر ایک نگاہ غائر سے تمام قطاروں کا جائزہ لیتیں اور اگر کسی کرسی پر کسی شاگرد کی کمی محسوس کرتیں تو اس کے بارے میں دریافت کرتیں اور پچھلی کلاس میں کوئی غیر حاضر ہوتا تو اس سے غیر حاضری کی وجہ معلوم کرتیں۔ ان کا حافظہ غیر معمولی تھا اور انہیں عام طور پر ہر شاگرد کے نام، اس کی نشست، اس کی تعلیمی حالت، حاضری اور غیر حاضری کے بارے میں ہر بات یاد رہتی۔ ان کی نگاہ غلط انداز، وہ بلا نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے، کا تجربہ بھی زینت آپا کے شاگرد خوب کیا کرتے اور کبھی کبھی یہ سوچا کرتے کہ ؎

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

مختصر یہ کہ خاموش جائزہ ہمارے لئے لطف خاص کا پیامبر ہوا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ اس جائزہ کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا تھا کہ ایک لمحے کے لئے سہی طالب علم کے دل میں اتر کر خلوت در انجمن کی فضا پیدا کر دی جائے اور استاد و شاگرد کے درمیان فکری و جذباتی ربط استوار ہو جائے ـــــ کلاس روم کے

باہر یہ رابطہ اور زیادہ گمبھیر ہو جاتا تھا ـــ اس معاملے میں زینت آپا کا کوئی حریف نہیں۔ کم از کم میری نظر سے تو کوئی ایسا استاد نہیں گزرا۔

اسی رابطے کا نتیجہ ہے کہ طالب علم کی زندگی زینت آپا کے لئے کھلی کتاب ہوتی ہے، جس کے ہر صفحہ پر، ہر لفظ اور ہر لفظ کے مختلف مفاہیم اور بین السطور پر اُن کی نظر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ صرف استاد نہیں ہیں، دوست، رفیق، ہم سفر غم گسار اور رہنما بھی ہیں۔ اس طرح ان کے اور ان کے شاگرد کے درمیان ایک ایسا رشتہ قائم ہو جاتا ہے جو زندگی بھر برقرار رہتا ہے اور وقت و فاصلے کی گرد اس کو دھندلا نہیں سکتی۔

طالب علمی کی ساری زندگی میں ایسا کوئی اور اُستاد میری نظر سے نہیں گزرا۔ اس مشاہدہ کے متعلق میں نے ہمیشہ یہی محسوس کیا تھا کہ بہ حیثیت اُستاد وہ اپنے سارے شاگردوں کے نہ صرف دلی خیالات کا اندازہ کرنا چاہتی ہیں بلکہ ان کی صلاحیتوں سے واقفیت حاصل کر کے ان کی صحیح رہنمائی کو بھی اپنے فرائض میں سے ایک فرض تصور کرتی ہیں۔ حاضری لیتے ہوئے وہ اپنے شاگردوں کے ناموں پر بھی کچھ نہ کچھ رائے زنی ضرور کرتیں، جس کی وجہ ہم کو تو یہی سمجھ میں آتی کہ ہر شئے کی معنویت سے وہ اپنے شاگردوں کو متعارف کرانا چاہتی ہیں، اس وقت صرف دو نام ذہن میں ہیں اور وہ ہیں مُبین مسعود اور رباب رضا رضوی۔ زینت آپا ان ناموں کو پکارنے کے بعد عرصہ تک ہر کلاس میں یہ کہا کرتیں کہ یہ نام موسیقیت رکھتے ہیں۔ ہم سوچا کرتے کہ کاش ہمارے نام میں بھی ایسی کوئی خصوصیت ہوتی جس کا تذکرہ کلاس میں ہو سکتا۔ اُستاد بننے کے بعد اپنے شاگردوں کے ناموں پر ایسے ریمارک کرنا ہمارا بھی شعار رہا۔

زینت آپا سے ہم نے غالب اور دوسروں کی غزلیں پڑھیں نثر میں وہ تاریخ ادب اردو پڑھاتی تھیں۔ اور بھی کچھ مضامین ان سے پڑھے ہیں۔ ان کے پڑھانے کا ایک مخصوص انداز تھا۔ غالب کے اکثر اشعار کو روزمرہ کی زندگی سے مطابقت دے دیا کرتی تھیں۔ انٹرمیڈیٹ کی لڑکیاں غالب کی گہرائی تک پہونچنے کے لئے ایسے چٹکلوں کی طالب رہا کرتی ہیں۔ دم تحریر ایسے دو شعر یاد آگئے ؎

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقت سفر یاد آیا
آتش دوزخ میں وہ گرمی کہاں
سوز غم ہائے نہانی اور ہے

پہلے شعر کے متعلق وہ اپنے کسی اُستاد کی تفہیم کا اعادہ کرتیں جو ٹھیٹھ دکنی زبان میں ہوا کرتا۔ "بیوی گاؤں جارہی تھیں۔ ریل چلنے کے بعد اسٹیشن سے باہر نکل کر پان والے سے پان لے کر منہ میں رکھا۔ اتنے میں ریل کی سیٹی سُن کر پھر خیال آیا الوں چلے گئے نا۔ یہی ہے دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز۔ پھر ترا وقت سفر یاد آیا"۔ یقین مانیئے جب بھی ریلوے اسٹیشن کے قریب پان کی دُکان نظر آتی ہے یہ شعر ضرور یاد آجاتا ہے۔ اسی طرح دوسرے شعر کی تشریح کرتے ہوئے کہتی تھیں کہ گرمی کے موسم میں میری ایک دوست کا خانساماں چلا گیا۔ جب اُس کو چولہے کے سامنے کھڑا ہو کر پکوان کرنا پڑا تو اس نے کہا کہ طالب علمی کے زمانے میں غالب کا شعر آتش دوزخ میں وہ گرمی کہاں بڑا تڑپا دینے والا شعر ہوا کرتا تھا لیکن اب سوچتی ہوں کہ غالب بھی کس قدر ناتجربہ کار تھے۔ گرمی میں باورچی خانہ میں کبھی پکوان کیا ہوتا تو سمجھ میں آتا کہ آتش دوزخ کی گرمی تیز ہے کہ سوز غم ہائے نہانی۔ جب کبھی گرمی میں پکوان کرنا پڑا یہ تشریح ضرور یاد آئی۔ ان چٹکلوں کے ذریعہ زینت آپا ایک ذہنی فضا پیدا کر دیتیں

اور شعر کو ذہن سے قریب کر کے اصل مضمون کی طرف گریز کرتیں اور
اس کی اشکال اس خوبصورتی سے کھولتی جاتیں کہ ہم حیران
رہ جاتے اور چٹکلے کے ساتھ شعر کا حقیقی مفہوم ہمیشہ کے
لئے ذہن میں محفوظ ہو جاتا۔

حالی کی مسدس کے شاعر کی حیثیت سے واقفیت
تھی اور یہ بھی جانتے تھے کہ سرسید اس کو اپنی بخشش کا وسیلہ
مانتے تھے لیکن غزل کے حالی سے ہم بالکل ناواقف تھے۔
اسکول کی درسی کتابوں میں جن شعرا کی غزلیں ہوتیں ان میں
کبھی حالی کی غزل بھی ہوتی تھی اور ہم سوچتے کہ حالی کا مطالعہ
بحیثیت غزل گو خالی از دلچسپی ہوگا، لیکن زینت آپا نے کچھ
اس انداز سے حالی کی غزلیات پڑھائیں کہ ہم میں مسدس سے
پہلے کے اور مسدس کے بعد کے غزل گو حالی میں امتیاز کرنے
اور ان کی قدیم اور جدید غزل کے پرکھنے کا شعور پیدا ہوا۔ وہ
جدید رنگ کے امام ہیں ہی لیکن ان کی قدیم غزلیں بھی اپنا جواب
نہیں رکھتیں۔ ہم کو آج تک بھی حالی کی غزلیات فیض کی سی
لطافت سموئے ہوئے نظر آتی ہیں۔ زینت آپا سے حالی کو پڑھ
کر معلوم ہوا کہ ؎

تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

والا حالی غزل کا بھی بڑا شاعر تھا۔

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر پہ زباں میں نے

تو محسوس ہوا کہ یہ سب بھی تو "تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب"
کی ہی تفسیر ہے۔

تاریخ ادب اردو پڑھانے کے بعد زینت آپا ہم کو
نوٹس بھی لکھایا کرتی تھیں۔ یہ نوٹس وہ اپنے حافظے کی مدد
سے فی البدیہہ لکھواتی تھیں لیکن روانی کا یہ عالم ہوتا کہ دریا
بہہ رہا ہے، ربط و تسلسل ایسا کہ کوئی مقالہ پڑھ رہی ہوں اور
حسنِ بیان کی یہ کیفیت کہ نئی آبِ حیات کی تخلیق ہو رہی ہے۔
تاریخ ادب کا ایک ایک دور ہمارے ذہنوں اور کاپیوں
میں نقل ہوتا جاتا، اپنی تاریخی، سماجی اور تہذیبی معنویت
کے ساتھ۔ نمائندہ شاعروں اور مصنفین کے مرقعے ابھرتے
جاتے، حقیقی، زندہ، بیدار، عہد آفریں۔ وہ شاعروں کے
کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے بے شمار شعر سناتی جاتیں جن سے
شاعر کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی اور ہمارے ادبی ذوق کی تربیت
اور تہذیب بھی ہوتی جاتی۔ چند شعر جو یاد رہ گئے ہیں درج
کرتی ہوں۔

ولی اس گوہرِ کانِ حیا کی کیا کہوں خوبی
مرے گھر اس طرح آوے ہے جیوں سینے میں راز آوے

شۂ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباسِ برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی

چلی سمتِ غیب سے کیا ہوا کہ چمن ظہور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہو سو ہری رہی

سودا قمارِ عشق میں شیریں سے کوہ کن
بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے پھر تو آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

حکیم مومن خاں مومن کے متعلق زینت آپا بتاتی تھیں کہ کسی
پردہ نشین کی آواز نے انھیں مسحور کر دیا تھا غالباً یہی وجہ ہے
کہ آواز سے متعلق مومن کے یہاں بہترین اشعار ملتے ہیں۔ وہ مشہور

معروف شعر یہ ہے

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

دشنام یار طبع حزیں پر گراں نہیں
اے ہم نفس نزاکت آواز دیکھنا

واقعی اس کے مقابل غالب کا کتنے شیریں ہیں تیرے لب والا شعر کس قدر پھیکا سیٹھا سا لگتا ہے۔

مومن کی ایک اور خصوصیت ان کے تخلص کی مقطع میں معنویت ہے ؎

اللہ رے گمرہی بت و بت خانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبہ کو ایک پارسا کے ساتھ

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

پیہم سجود پائے صنم پر دم وداع
مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

میر درد کے متعلق بتاتی تھیں کہ ان کی شاعری واقعی صوفیانہ شاعری ہے۔ ان کا محبوب مجازی محبوب نہیں حقیقی ہے۔

ہماری طالب علمی کا دور ترقی پسند تحریک کے عروج کا دور تھا۔ اس دور میں عشق کی صرف مجازی کیفیت قابل تحسین تھی۔ اس لئے صوفیانہ شاعری کو قابل اعتنا نہیں سمجھا جاتا تھا لیکن زینت آپا "ترقی پسند" ہونے کے باوجود درد کی شاعری کی معترف تھیں۔ البتہ بعض اشعار کی نشان دہی کرتی تھیں جن کے بارے میں وہ کہتی تھیں کہ ہو سکتا ہے کہ ان اشعار کو بنیاد بنا کر درد پر ریسرچ کی جائے تو "حقیقت" کے پردے میں کوئی مجاز نظر نواز ہو جائے۔

کسی بھی لٹریچر کی تعلیم دینے والا ہر اچھا استاد شعر پڑھاتے ہوئے اس سے مماثل اسی شاعر یا دوسرے شعرا کے اشعار کا حوالہ ضرور دیا کرتا ہے۔ اس ضمن میں زینت آپا کی خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے ہمیشہ ایسے اشعار سنائے جو اعلیٰ پایہ کے ہوتے ہوئے بھی زبان زد خاص و عام نہ ہوتے ایسے اشعار جو اس وقت ذہن میں محفوظ ہیں وہ یہ ہیں۔

دیر و حرم آئینہ تکرار و تمنا
واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں

مٹتا ہے فوت فرصت ہستی کا غم کہیں
عمر عزیز صرف عبادت ہی کیوں نہ ہو

ادھر سے بھی ہے سوا کچھ ادھر کی مجبوری
کہ ہم نے آہ تو کی ان سے آہ بھی نہ ہوئی

رات اک بزم میں تھے جو گلہ و جفا کے شکوے
دل بھر آیا جو تری مہر و وفا یاد آئی

اپنے شاگردوں میں اعلیٰ ذوق کی نشو و نما کے لئے وہ نا یدراز نصاب لٹریچر بھی لاتیں اور سنایا کرتیں، جس سے اس دور کے اچھے افسانوں، تنقیدوں اور اچھے کلام سے متعارف ہونے کا موقع ملتا۔ اس سلسلے میں بھی دو چیزیں میرے ذہن میں ہیں ایک توفیق کی نظم "رقیب سے" جس میں زینت آپا کو حاصل نظم یہ شعر نظر آتا ؎

ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا پایا ہے
جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں

احمد ندیم قاسمی کا ایک افسانہ "ست بھرائی سات بھائیوں والی بہن سنایا تھا۔ میں نے ایک بار غیر منقسم ہندوستان کے پانچ دریاؤں والی سرزمین کو تقسیم کے بعد سرسری طور سے دیکھا تھا۔ سنگل کے اسٹیشن پر شام گزری تھی تو بجلیاں چمک رہی تھیں اور ابر گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ ست بھرائی میں زینت آپا کی زبان سے سنے ہوئے جملے خود بخود ذہن میں تند مکرر کا مزہ دے رہے تھے۔

کلاس میں لٹریچر کے شاہ کار سنانے کے علاوہ اکثر ایسی کتابوں، افسانوں، نظموں وغیرہ کا تذکرہ بھی کرتیں جو ان کے پسند خاطر ہوا کرتی تھیں۔ اگر شاگرد ان کتابوں کو پڑھنے کا اشتیاق ظاہر کرتے اور یہ کہتے کہ وہ کتاب دستیاب نہیں ہوسکی تو خود ہی کتاب پڑھنے کے لئے لادیتیں۔ ایسا ہی ایک افسانہ اشفاق احمد کا "بندرابن کی کنج گلی میں تھا"۔ پتہ نہیں یہ افسانہ کتابی شکل میں محفوظ ہوا کہ نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اُردو ادب کے ایسے افسانوں میں ہے، جنہیں دنیا کے ادب عالیہ میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ ایک اور کتاب جس کو اُردو کی منفرد کتاب کہا جاسکتا ہے وہ محمد ی ل احمد کی کتاب محبت کا افسانہ۔ اس طرح مختلف کتابوں اور ادب پاروں کے متعلق اہم باتیں بھی ہمارے لئے بیش بہا معلومات فراہم کرتیں مثلاً یہ کہ نذیر احمد کے ناول ابن الوقت کا اصلی ہیرو، بنے بھائی کا ناول لندن کی ایک رات کا اصلی ہیرو ـــــ غالب کا اصلی محبوب۔ بہت سی باتوں کی زینت آپا نے نشان دہی کی تھی جن سے ان کتابوں اور شہ پاروں اور ان کے مصنفین کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے لیکن ان کے نام اور مصنف اور بین السطور واقعات یادوں کی گرد میں یوں چھپے ہوئے ہیں کہ حافظے کے نہ خانوں سے ان کو اُٹھانے کی کوشش کرتی رہوں تو کافی وقت درکار ہوگا۔

تعلیم کے میدان میں وہ بڑے جرأت مند ترقی پسند تجربات کیا کرتی تھیں۔ اس کی سب سے عمدہ مثال امتحانی پرچہ کا امتحان سے قبل ہی کلاس میں علی الاعلان مرتب کرنا ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ کہا کرتی تھیں کہ میں اس کی قائل نہیں ہوں کہ قابلیت کا امتحان لاعلمی میں لیا جائے۔ میں اپنے پرچے کا ہر سوال تمہیں بتادوں گی اور یہ اُمید رکھوں گی کہ تم لوگ خوب اچھی طرح ان سوالات کو تیار کرو اور پھر جب امتحانات کے نمبر سناتیں تو خوب خفا ہوتیں کہ میں نے پرچہ بتادیا تھا لیکن اس کے باوجود تمہارے جوابات اطمینان بخش نہیں ہیں۔

آج کل ہمارے ہاں امتحانات کی اصلاح کے سلسلے میں "کھلی کتاب" کے تجربے پر غور کیا جارہا ہے۔ زینت آپا برسوں پہلے اپنے انداز میں یہ تجربہ کرچکی ہیں، جو بہت کامیاب رہا۔ ان کا خیال تھا کہ طالب علم کے حافظے کا امتحان لے کر اس کی صلاحیت اور قابلیت کا جو بھی اندازہ کیا جائے گا وہ غلط ہوگا۔ سوالات قبل از قبل معلوم ہوجائیں اور امتحانی پرچے حل کرتے وقت طالب علم کے سامنے بیسیوں کتابیں موجود ہوں تب بھی ان سے نکما طالب علم کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اس کے برخلاف طالب علم ذہین اور اپنے مضمون پر حاوی ہو تو یہ چیزیں اس کی مدد کرتی ہیں اور ہم آسانی کے ساتھ اس کی ذہنی استعداد، موضوع پر گرفت، استدلال کی صلاحیت، اس کے تخلیقی اور تجرباتی مزاج، اس کے ادبی اور تنقیدی شعور اس کے اسلوب اور طرز ادا کے بارے میں صحیح رائے قائم کرسکتے ہیں۔

زینت آپا کے اس تجربے سے ہمیں بہت فائدہ ہوا۔ اس معاملے میں میں نے زینت آپا کی تقلید کی ہے۔ اس لئے مجھے طالب علم اور اُستاد دونوں حیثیتوں سے اس کے فوائد کا عملی تجربہ ہے۔

کالج میں مضمون نویسی کی مشق کروائی جاتی تھی ـــ زینت آپا مضامین کی اصلاح پر خاص توجہ دیتی تھیں۔ طالبہ کم زور ہوتی تو ایسا رویہ اختیار کرتیں کہ اس کا حوصلہ پست ہونے نہ پائے بلکہ اس میں اُمنگ اور شوق پیدا ہو اور وہ زیادہ سے زیادہ محنت کرکے اپنی کمزوریاں دور کرسکے ذہین طالبات کی دل کھول کر ہمت افزائی کرتیں۔ ان کے ایک ایک فقرے اور ایک ایک جملے پر داد دیتیں۔ تمام طالبات کی ان کے

ذہن میں درجہ بندی ہوتی اور وہ اُن کی استعداد اور ذوق کے مطابق مطالعہ کے لئے کتابیں تجویز کرتیں۔ صاحب طرز ادیبوں کی منتخب کتابوں کو بار بار پڑھنے کا مشورہ دیتیں اور یہ معلوم کرنے کے لئے کہ طالبات نے ان کتابوں کو کتنا پڑھا اور سمجھا ہے اور ان سے کتنی متاثر ہوئی ہیں، بڑی خوش اسلوبی سے کسی مناسب موقع پہ بحث چھیڑ دیتیں۔ ہمیں اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ ہمارا امتحان لے رہی ہیں۔ اکثر ہم امتحان میں پوری اترتیں اور وہ باغ باغ ہو جاتیں۔

دو چیزوں سے انہیں چڑ تھی۔ بعض لڑکیاں ہر دوسری تیسری سطر کے بعد ایک لمبا ڈیش اور دو تین سوالیہ اور استفہامیہ علامتیں بنا دیتیں ـــــ زینت آپا بڑے لطیف پیرائے میں ان کا مذاق اڑاتیں۔ طالب علمی کے زمانے میں شاید یہ رجحان مجھ میں نہیں رہا، اور اگر رہا ہو تو زینت آپا کے مسلسل ریمارک کے بعد ختم ہو گیا۔ اب ان خطوط اور علامتوں سے وحشت سی ہونے لگتی ہے۔

زینت آپا کی دوسری تنقید لفظ سماج کے بے دریغ استعمال پر ہوتی تھی۔ اکثر لڑکیاں اپنے مضامین میں ظالم سماج کا بار بار ذکر کرتیں اور اس کی زیادتیوں کا رونا روتیں۔ زینت آپا کہتیں آخر سماج ہے کیا چیز۔ افراد ہی سے سماج بنتا ہے۔ اس لئے اگر سماج خراب ہے اور ظالم ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم خود خراب اور ظالم ہیں اور ہم سب پر اپنی اصلاح کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور اگر ہمارا تعلق سماج کے اس حصے سے ہے جو مجبور اور مظلوم ہے تو ہماری ذمہ داری دوہری ہو جاتی ہے۔ ظلم سہنا سب سے بڑا ظلم ہے۔ زینت آپا کا یہ تجربہ بڑے گہرے شعور کا آئینہ دار ہے۔

شاگردوں کی اصلاح کے لئے زینت آپا بڑے نوزوں اور ندرت سے مملو تجربات کیا کرتی تھیں۔ ہماری ایک ساتھی پان کھا کر کلاس میں آتی تھیں۔ اُنہوں نے ہم سب سے مخاطب ہو کر کہا جعفری آپا (یہ ان کی استاد تھیں) کی کلاس میں کوئی لڑکی پان کھا کر آتی تو وہ اسی وقت ریت منگوا کر دانت منجواتیں۔ ہماری ساتھی نے، جو زینت آپا کے چاہنے والوں میں سے تھی، بڑے ادب سے کہا: "میرے لیئے کیا حکم؟ اس کے بعد ان کی کلاس میں کوئی پان کھا کر نہ آیا۔ اگر شاگردوں کی بات ناگوار ہوتی تو وہ فوراً اپنی جعفری آپا کا تذکرہ کرتیں۔ کہتیں کہ ہم جب جعفری آپا سے پڑھتے تھے اور ان کو ہماری کوئی بات ناگوار ہوتی تو وہ کہتیں بی بیو آپ کے کالج کے بورڈ پہ ویمنز کالج لکھا ہے، گرلز کالج نہیں، اب آپ لڑکیاں نہیں عورتیں ہیں۔"

میں نے بھی زینت آپا کے نقشِ قدم پہ چلنے کی کوشش کی ہے۔ جب گنٹور کے ویمنز کالج میں پڑھاتی تھی اور اپنے شاگردوں کی کوئی بات ناگوار ہوتی تو میں زینت آپا کا جملہ دھرا کرتی تھی۔ یہ تجربہ خاصا کامیاب ثابت ہوتا۔ میں سوچتی ہوں کہ اگر میرا تقرر کسی ایسے کالج میں ہوتا، جس کا نام گرلز کالج ہوتا، جیسا کہ علیگڑھ یونیورسٹی میں ہے، تو پھر میں کیا کرتی؟

زینت آپا اپنے استادوں کا بڑے عزت و احترام سے ذکر کرتی تھیں۔ ان میں ایک بھائی جان عبدالحمید خاں صاحب استاد فارسی جن کے بارے میں زینت آپا نے بہت اچھا مضمون لکھا ہے تھے اور دوسرے سجاد صاحب۔ یہاں تک کہ اپنے ایک لڑکے کا نام اپنے استاد ڈاکٹر سید سجاد کے نام پر رکھا ہے۔ صلاح الدین صاحب کی شاگرد تو نہیں تھیں لیکن ان کے متعلق جو کچھ کہا کرتیں افسوس کہ میں صلاح الدین صاحب کو سنا نہ پائی۔ زینت آپا کہتی تھیں کہ ولی الدین صاحب تصوف کے استاد ہیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کا قلندر صلاح الدین صاحب میں اتر آیا ہے۔ ادیب گر یا لو آپا کا بھی ذکر بڑے ادب سے کرتیں

مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں بھی بانو آپا مرحومہ کی شاگرد رہی ہوں میری چھوٹی سی ادبی شخصیت زینت آپا اور انہیں کی رہین منت ہے۔

جب ہم انٹرمیڈیٹ میں پڑھتی تھیں تو دور عثمانی کا نصاب تعلیم ہی مروج تھا، ہم دینیات بھی پڑھا کرتیں۔ دینیات میں میری رشتہ دار بہنیں حسنہ بیگم اور صفورہ بیگم مرحومہ زینت آپا کی کلاس میں تھیں اور وہ اس کلاس میں جو بھی سنتیں اس کا تذکرہ کچھ اس انداز سے کرتیں کہ جی چاہتا کہ اچھائی کی ایسی تعلیم سے ہم کیوں محروم رہیں۔ لیکن ہر سیکشن میں طالبات کی ایک خاص تعداد مقرر تھی اگر کوئی اے سیکشن سے بی میں منتقل ہونا چاہتا تو بی سیکشن کی کسی لڑکی کو ہمارے بجائے اے سیکشن میں منتقل ہونے پر آمادہ کرنا پڑتا تھا۔ ہمارا ذوق و شوق دیکھ کر زینت آپا کے سیکشن کی ایک ساتھی نے کہا کہ وہ ہمارے سیکشن میں منتقل ہونے کو تیار ہے۔ میں نے زینت آپا سے تذکرہ کیا تو انہوں نے کہا کہ اگر کوئی لڑکی ان کے سیکشن سے جانے پر آمادہ ہو گی تو وہ مجھے اپنے سیکشن میں آنے کی اجازت دیں گی۔

ہم جب اپنے سیکشن سے اُٹھے تو ہماری لکچرار نے اس طرح کی تبدیلی پر جو ریمارک کئے اس کا مقابلہ زینت آپا کے ایک سیدھے سادے جملے سے کیا تو خیال آیا کہ زینت آپا کتنی بلند ہیں۔ اُنھوں نے ہماری ہم جماعت لڑکی سے صرف اتنا کہا تھا کہ "آپ فلاں سیکشن میں جا سکتی ہیں"۔

ہر کالج میں طلبہ اور طالبات کے مختلف گروپ ہوتے ہیں۔ ان میں ایک گروپ وہ ہوتا ہے۔ جو بہترین اسکولوں سے آتا ہے۔ عموماً یہ اس طبقے کے ہوتے ہیں جس کو رائج الوقت اصطلاح میں "بہتر سوشیو اکنامک گروپ" کہا جاتا ہے۔ وہ بچے مستعلیق نظر آتے ہیں اور اس کے لیے بڑا اہتمام کرتے ہیں۔ ان کا تعلیمی معیار بھی نسبتاً اچھا ہی ہوتا ہے۔ اساتذہ کو ان کے والدین سے فائدہ اُٹھانے کے مواقع حاصل رہتے ہیں۔ ان سب باتوں کی وجہ سے وہ اکثر اساتذہ کے منظورِ نظر بن جاتے ہیں۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ کسی مضمون میں معمولی اسکولوں سے آنے والے بعض طلبہ زیادہ تیز ہوتے ہیں۔ اس کلاس میں اتفاقاً کوئی طالب علم بہتر سوشیو اکنامک گروپ کا ہو تو اساتذہ اچھا پڑھنے والے طالب علم کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی توجہ کا مرکز بہتر سوشیو اکنامک گروپ کے طالب علم کو بنا لیے رکھتے ہیں۔ یہ اساتذہ کا ایک ایسا کمزور پہلو ہے کہ ٹریننگ پائے والے ٹیچر بھی ٹریننگ کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کمزوری پر قابو پاتے خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ لیکن زینت آپا کے پاس طالب علم کو سراہنے کا معیار خود طالب علم کی ذاتی قابلیت ہوتی تھی۔ وہ نہ صرف یہ کہ اس کی کلاس میں اس کی تعریف کرتیں بلکہ دوسری کلاسوں میں بھی اس کا ذکر بڑے پیار اور چاؤ سے کرتی تھیں۔ اپنے طالب علموں کو انہوں نے خواہ کبھی بھی پڑھایا ہو، کبھی فراموش نہیں کیا۔ ہر دور کے طالب علموں کے سامنے اپنے اچھے اور ذہین شاگردوں کا تذکرہ وہ برابر کرتی رہیں۔ یہ ان کی ایسی خصوصیت ہے جس کی شاید ہی مثال ملے۔ اچھے استادوں کو یاد رکھنے والے شاگرد بے شمار ہو سکتے ہیں لیکن اچھے شاگردوں کو یاد رکھنے والے اساتذہ ہی

سراپا سجدہ انبیاء، بندگی انتخاب
کے مستحق ہوتے ہیں۔

زینت آپا اپنے ادبی ذوق کی بلندی، مطالعہ کی ہمہ گیری شعور کی گہرائی و گیرائی اور بے مثال مقبولیت کے باوجود ارباب جامعہ کی ناقدری کا شکار رہیں۔ اس بارے میں ارباب جامعہ کی بدذوقی اور کم نگہی کا جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مدراس کے کرسچن کالج اور عثمانیہ یونیورسٹی نے ساتھ ساتھ جنم لیا تھا۔ یہ دونوں ادارے اپنے اپنے میدان میں منفرد مانے جاتے ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی اپنی شاندار عمارتوں کی وجہ سے اور کرسچن کالج پڑھائی کے معیار کی وجہ سے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کیوں معنوی طور پر بلند نہ ہوسکی اس کی کئی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ یہاں کے ارباب اقتدار نے اپنے بہترین اساتذہ کی قدر نہیں کی اور آج بھی شاید ان حالات میں زیادہ تبدیلی نہیں ہوئی۔

آمینہ مینائی زینت آپا کے متعلق کہا کرتی تھیں ؎

نظر نواز رہے جامعہ نواز رہے ۔ رہے مجاز کدہ زینت مجاز رہے

کاش جامعہ کے شعبہ اردو کے طالب علموں کو بھی ایسا ہی سوچنے کا موقع نصیب ہوسکے۔

★★

یکم نومبر ۱۹۸۰ء کی صبح ہمارے حق میں "صبح بہاراں" بن کر آئی جس کی اولین ساعتوں میں وشال آندھرا کی ایک تاریخی عمارت "جوبلی ہال" کے خوبصورت، بلند و بالا کشادہ ایوان میں ریاستی حکومت کی جانب سے "بہشت پیغمبر ایوارڈ" کی یادگار تقریب انجام پائی۔ ایوارڈ پانے والی معزز شخصیتوں میں ایک شخصیت وہ بھی تھی جسے ہم اپنی رگ جاں کی طرح عزیز رکھتے ہیں۔ یعنی ہماری مشفق، مہربان، محبوب و مربی استاد، محترم زینت آپا صاحبہ۔ ریاستی حکومت کے ارباب بست و کشاد اور ایوارڈ کمیٹی کے معزز اصحاب اپنی جوہر شناس نظر انتخاب کے لیے ہم سب کی دلی مبارکباد اور شکریہ کے مستحق ہیں کہ ان کے حسن انتخاب کی بدولت زمانے کو ایک جوہر کی قدر دانی کا حوصلہ ملا۔

پچھلے زمانے میں لوگ خاص خاص موقعوں پر دیوانِ حافظ سے فال لیا کرتے تھے۔ اسی طرح مجھے قرآن مجید سے تفاؤل لینے کی عادت ہے۔ میں نے حسب معمول فجر کے وقت قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے آپا کے لیے فال دیکھا۔ کیا بتاؤں کیا پیاری اور برمحل آیت نکلی اور شانِ خداوندی دیکھیے کہ اس میں لفظ "زینت" بھی موجود۔ وہ آیت ہے

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ؕ

ترجمہ:۔ "اور جو چیز تم کو دی گئی ہے، وہ دنیا کی زندگی کا فائدہ اور اس کی زینت ہے اور اللہ کی طرف سے جو کچھ ملنے والا ہے وہ (اس سے

رفیع رؤف

مباش منکر زینت کہ در نہ مانست

بھی بہتر اور باقی رہنے والی ہے" (سورہ قصص)

اس قرآنی بشارت پر دل بے اختیار بارگاہ خداوندی میں سجدہ ریز ہو گیا اور ایک رقت کے عالم میں دل سے دعائیں نکلیں کہ خداوند کریم یہ بشارت آپا کے حق میں مبارک ہو۔ صحت و سلامتی اور درازی عمر کے ساتھ ساتھ عزت و تکریم کی ایسی بے پایاں نعمتوں سے بار بار سرفراز ہوتی رہیں، ایسی پُرمسرت تہنیتی محفلیں ہزار بار سجتی رہیں اور ہم شاگردوں کے نصیب میں ایسی سعادت بار بار آئے کہ ہم اس بارگہ خانوادہ مرتضوی میں نذرانۂ عقیدت پیش کرتے رہیں۔ (آمین ثم آمین)

اور آج جبکہ یہ سعادت ہمارے نصیب میں آ گئی ہے اور ہمیں اظہار عقیدت کا موقع ملا ہے تو ہم اپنی جرأت اور حوصلے پر حیران ہیں کہ کل تک جس شخصیت کے سراپے کو مہ و سال کے قد آدم آئینوں میں دیکھتے ہوئے نگاہیں لڑکھڑا جاتی تھیں آج اس شخصیت کے کو کس طرح آئینۂ تحریر میں لائیں۔ وہ بھی ہم جیسے تہی مایہ شاگرد جنھیں اس سرچشمۂ علم و ادب سے لبالب ساغر کی بجائے جرعۂ ہی پر اکتفا کرنا پڑا۔ لیکن وفورِ شوق نے بڑھاوا دیا اور دیوانگی نے قلم سنبھالا، جذبۂ عقیدت نے رہبری کی اور جو بھی ہم نیاز رقم کر سکے گئے۔

ابھی قلم اٹھایا ہی تھا کہ اس شخصیت کے کتنا جانے پہلوؤں نے ہماری نگاہوں کو خیرہ کر دیا۔ دل نے پوچھا اس تراشیدہ ہیرے کے

کس کس پہلو کا جلوہ دیکھو گے۔ کیا اس حسن کو دیکھنے کی تجھ میں تاب ہے جسے فطرت نے جوہر ملکوتی بخشے ہوں، جو پُرسوز نگہ بیباک و آزاد ہے۔ جو ایک ایسا بندۂ حق بیں وحق اندیش ہے کہ زہر ہلاہل کو کبھی قند نہ کہہ سکا۔

پھر ہماری نگاہوں کے سامنے شخصیت کا وہ پہلو آیا جو صاحب طرز ادیب بھی ہے؛ افسانہ نگار بھی، مرقع نگار بھی انشا پرداز بھی، محقق اور نقاد بھی۔ جن کی ادبی تخلیقات میں تاریخ، تنقید، مرقعے، افسانے اور انشائیے سب ہی شامل ہیں۔

ہمارے سامنے شخصیت کا وہ پہلو بھی تھا جو ملک کی مختلف علمی، ادبی اور تہذیبی اداروں کی رکن، مشیر اور سرپرست ہے۔

پھر اس شخصیت کے وہ تابناک پہلو بھی ہمارے سامنے آئے جیسے غالب اور اقبال پر امتیازی مانا جاتا ہے اور دکھنیات پر جن کی نظر مسلمہ ہے۔

اگر "من لگن" "کلیات بحری" "کلیات شاہی" اور "نوسرہار" پر آپا کا تحقیقی کام نہ بھی ہوتا تب بھی دکھنی زبان اور ادب پر آپ کا حق مسلمہ تھا۔ اس لیے کہ یہ زبان آپ کے گھر کی ہے

ضرورت تو اس بات کی ہے کہ آپا کی شخصیت کے ہر پہلو کا فرداً فرداً جائزہ لیا جائے لیکن ہم اس کے مجاز نہ تھے۔ آداب شاگردی کا تقاضہ یہی تھا کہ ہم اپنی تمام تر توجہ صرف اس شخصیت پر مرکوز رکھیں جو استاد کی حیثیت سے ایک منفرد اور ممتاز مقام رکھتی ہے۔

شخصیت کی صورت گری میں خاندان، ماحول، تعلیم و تربیت کا اہم رول ہوتا ہے چنانچہ آپا کی شخصیت کے کسی بھی پہلو کو اجاگر کرنے سے پہلے اس سادات اور صوفی گھرانے کو مدنظر رکھنا ضروری ہے جو علم و عرفان کے بحر بے پایاں تھے۔ جن کے یہاں سیف کا کام نوک قلم سے لیا جاتا تھا۔ جن کی بارگاہ میں سر کی بجائے دل کے نذرانے قبول کیے جاتے تھے اور جن کی تخلیقات "من لگن" ہوتی تھیں۔ آپا کی شخصیت کا خمیر ان خانوادوں سے اٹھا ہے جن کے مورث اعلیٰ میں وہ نام آج بھی تاریخ میں درخشاں ہے۔ ایک حضرت شاہ محمد قادری لوندریا اور ——— جو دراصل لوہے والے تھے تواح بغداد میں مقیم تھے اور اسی مناسبت سے انھیں حموی بھی کہا جاتا تھا۔ سترھویں صدی عیسوی میں دکھن آگئے۔ جن میں آپ ایسے ادبی کہلائے۔ ڈاکٹر ماہی محمود عادل سلطنت بیجاپور میں قیام کیا۔ ضلع گلبرگہ کے موضع گوگی کا نصیبہ جاگا کہ یہی ان کا وطن قرار پایا۔

میر زیدی کو اسلامی معاشرے کے برہمن کہا جاتا ہے اس لیے کہ ان کے یہاں بھی برہمنوں کی طرح ذہانت و فطانت ورثے میں آتی ہے۔ جس طرح اقبال کو سپرو گھرانے کی ذہانت ورثے میں ملی اسی طرح زینت آپا کو جو غیر معمولی ذہانت، حاضر دماغی، دراکی اور حافظے کی قوت ملی ہے وہ خاندان مرتضوی سے اسی نسبت کے سبب ملی ہے۔ آپ کے مزاج میں جو عزت نفس، خودداری اور خودنگہداری ہے وہ انھیں غیور اور جری سادات کے طفیل ہے اور جس قلندرانہ بے نیازی، فراخدلی، اعلیٰ حوصلگی، تواضع و انکسار کو ہم آپا کی شخصیت کا جز دیکھتے ہیں وہ بھی انھیں صوفی گھرانوں کی دین ہے

آپا کو جو تحصیل علم سے طبعی مناسبت رہی ہے غور و خوض کی عادت رہی ہے۔ مطالعہ کا شوق رہا ہے اسی عالم و فاضل گھرانے کی عطا ہے۔ منجملہ ان قابلیتوں اور صلاحیتوں کے جو قدرت کی طرف سے آپا کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہیں سلسلہ آپا نے "من لگن" اور کلیات بحری جیسی کتابیں منتقل کی ہیں۔

اس علمی خاندان کی تربیت و تعلیم نے ان کی نشوونما میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ خود آپا کی شفیق استاد مرحومہ تسنیم یزدانی صاحبہ کو بار بار میں نے یہ کہتے سنا ہے کہ تمہاری زینت آپا کی ذہانت اور علمیت میں ان کے دادا کی شخصیت اور تربیت کا بڑا ہاتھ ہے زینت آپا کے ذوقِ تحقیق و جستجو کی تعریف کرتے ہوئے کہا کرتی تھیں کہ طالب علمی کے زمانے میں جب تک کسی لفظ کے معنی و مفہوم کے بیے تحقیق کے ساتھ تشفی نہ کرلیتیں کبھی آگے نہ بڑھتی تھیں۔ حافظے کی تعریف کرتے ہوئے کہا کرتی تھیں کہ ماشاء اللہ بلا کا حافظہ پایا ہے، سیکڑوں اشعار نوکِ زبان ہیں۔

زینت آپا کے یہاں ذوقِ تدریس اور پیشۂ تدریس سے دیانتدارانہ برتاؤ کا وصف بھی اسی سادات اور صوفی گھرانے سے آیا ہے، جہاں اس پیشے کے تقدس کا بطورِ خاص خیال رکھا جاتا، اور کبھی بھول کر بھی ایسا قدم نہیں اٹھایا جاتا جو استاد کے منصب اور مقام سے ہٹ کر ہو یا اس کے وقار کے منافی ہو۔ چنانچہ ہم نے اپنی استاد کو اجداد سے آج تک بفضلِ خدا انہی اوصاف کا حامل پایا ہے۔ وہی استادانہ بزرگی، وقار، مربیانہ شفقت اور خلوص جو ان کی گھٹی میں پڑا ہے، ان میں رمق برابر بھی فرق نہیں آیا۔ علم پروری اور طلبہ نوازی کا بے لوث جذبہ بھی انہی عالم گھرانوں کے دین ہے جن کے یہاں بہ یک وقت کئی کئی طالب علموں کے قیام و طعام وغیرہ کا انتظام رہا کرتا تھا۔ چنانچہ نادار طلبہ کی خبر گیری کرنا، ان کے لئے تحصیل علم کے مواقع فراہم کرنا، نہ صرف یہ کہ خود اعانت کرنا بلکہ صاحبِ ثروت اور ذی حیثیت لوگوں کو بھی ترغیب دلانا آپا کے تدریسی فرائض میں شامل ہیں۔ ہندوستان کے دور دراز شہروں سے بھی طالب علم آپا کا یہ وصف سن کر چلے آتے ہیں اور آپا کی سرپرستی اور رہبری میں تحصیل علم کی سہولتیں پاتے ہیں۔

آپا کی تدریسی صلاحیتوں کے اعتراف میں حضرت امیر خسرو کا صرف ایک شعر کافی ہے:۔

تو آں شاہے کہ بر ایوانِ حضرت
کبوتر گر نشیند باز گردد !

اگر آپ ہمارے اس دعوے کا ثبوت چاہتے ہوں تو پھر آپ کو چلنا ہوگا، عالم تصور ہی سہی، رزیڈنسی کالج۔ اس خوب صورت تاریخی عمارت کی بالائی منزل کا وہ خوشنما کمرہ جس کے گول برآمدے میں آم کے ایک بلند پیڑ کی ڈالیاں سجدہ ریز رہا کرتی تھیں۔ ہواؤں میں برف کی سی خنکی۔ رگوں میں خون منجمد کردینے والی سردی۔ ایسے عالم میں آپا سے ذرا غالب کو پڑھیے ایک ذرا چھیڑ کر تو دیکھئے !

دل کا ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر ؛ ہم اس کے ہیں، ہمارا پوچھنا کیا ، یا پھر یہ شعر
قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل ؛ کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا ، یا پھر یہ شعر
اُس کی اُمت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند ؛ واسطے جس شہ کے غالب گنبدِ بے در کھلا ، یا پھر یہ شعر
غالب ندیمِ دوست سے آتی ہے بوئے دوست ؛ مشغولِ حق ہوں بندگیِ بوتراب میں

ایک تو غالب کے کلام کی گہرائی پھر تصوف کی چاشنی پھر آپا کا وہ والہانہ انداز اور ان کی وہ دلآویز شخصیت اور کلاس روم کا وہ سحر انگیز ماحول ــــ ان سب کا حسین امتزاج جب ہم پہ پر تو افگن ہوتا تو ہمارے معصوم چہرے علم و آگہی کے

کے نور سے دمک اٹھتے ہیں۔

آپا کی غالب فہمی اور غالب شناسی کے معاملے میں ایک بات میں پوری ذمہ داری سے کہہ سکتی ہوں کہ آپ غالب پہ لکھی ہوئی تمام کتابیں بجز یادگارِ غالب کے ساری کی ساری کا پڑھ ڈالیے۔ خواہ وہ غالب نامہ ہو کہ ذکرِ غالب یا محاسن کلام غالب ہو کہ آہنگِ غالب وغیرہ۔ ایسی بیسیوں کتابیں آپ پڑھ لیجئے اور پھر اس کے بعد آپا سے غالب پڑھنے آئیے ایک ایک شعر کی تہہ سے معنی و مفہوم کے ایسے آبدار موتی نکال لائیں گی کہ آپ دریائے حیرت میں غرق نہ ہو جائیں تو ہمارا ذمہ! کلامِ غالب کی تہہ داری جب ہم پہ عیاں ہوگی تو عقل اپنی کم فہمی پر اور نظر اپنی کوتاہ بینی پر ماتم کرتی رہ جائے گی۔ آپا کی سخن فہمی اور نکتہ سنجی کے ضمن میں مولانا فضل حق خیرآبادی کا وہ واقعہ یاد کر لیجئے کہ جب ایک شخص مولانا کے یہاں ناصر علی سرہندی کے کسی شعر کا مفہوم پوچھنے آیا۔ مولانا نے اس شخص کو مرزا غالب کی طرف رجوع کیا۔ مرزا نے اس کے معنی سمجھائے پر اس شخص کی تشفی نہ ہوئی۔ وہ پھر مولانا کے یہاں لوٹ آیا اور کہا کہ مرزا نے جو معنی بتائے ہیں ناصر علی کا یہ مقصود نہیں۔ مولانا نے ڈپٹ کر کہا اگر ناصر علی نے وہ معنی مراد نہیں لیے جو مرزا نے سمجھے ہیں تو اس نے سخت غلطی کی ہے۔ یہی معاملہ آپا کی تشریح و توضیح کا ہوتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جو معنی و مفہوم آپا نے بتائے ہیں کہ اگر غالب نے وہ مراد نہیں لیے تو سخت غلطی کی ہے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ آپا کا یہ تمام ذہنی اور علمی سرمایہ بے دریغ لٹ گیا۔ اٹھائی گیرے تو ہم شاگرد ہی ہیں۔ آج مشہور درس گاہوں میں جتنی خواتین اور مرد غالب پڑھا رہے ہیں ان میں سے بیشتر یہی لیٹرے ہیں مگر اس لوٹ کو چوں کہ آپا نے ہمارے حق میں مباح کر دیا ہے اس لیے ہم قابلِ گرفت نہیں۔ اس مال کو مالِ غنیمت جان کر سینت سینت کر رکھتے ہیں پرزہ پرزہ سنبھال کر رکھتے ہیں کہ یہی ہمارے ذوقِ تدریس کی آبرو ہے

یہاں اس حقیقت کے اعتراف کے لیے مجھے اس سے بہتر اور کوئی موقع نہیں ملے گا کہ جس وقت میں اپنے انٹرویو کے لیے جا رہی تھی غالب کے نام پہ میرے ترکش میں صرف ایک ہی تیر تھا اور وہ تھا دیوانِ غالب کی پہلی غزل کا پہلا شعر اس کی تفسیر اگر بیان کرنے لگوں تو تمام وقت اسی کی نذر ہو جائے۔ اس کو ہماری خوش قسمتی ہی جانیے کہ ترکش کا صرف یہی ایک تیر کام آگیا۔ تیر کس طرح نشانہ پر بیٹھا اس کی گواہی آپ ہمارے استاد محترم ڈاکٹر حفیظ قتیل صاحب سے لے سکتے ہیں جو اس وقت سلکشن کمیٹی کے ممبر تھے۔

اب ایک جھلک میں آپ کو اس استاد کی بھی دکھا دوں جو "اقبال" پڑھا رہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کو اقبال سے زیادہ غالب عزیز ہے لیکن مقاماتِ اقبال کا وہ منکر بھی نہیں۔ وہ افکارِ اقبال کا محرم ہے، اسرارِ خودی کا رمز شناس ہے فلسفۂ خودی فلسفۂ حیات کے بحرِ ناپیدا کنار کا شناور ہے۔ دریائے عشق کا غوطہ زن ہے۔ تصوف اور جذب و مستی کے لولوئے شاہوار اس کے گوشۂ ہوش کے آویزے ہیں۔ اقبال کا مردِ مومن اس کا اپنا محبوب ہے۔ کلامِ اقبال کے ہر خط و خال کو وہ بڑی گہری نظر سے پڑھ سکتا ہے اور سمجھا سکتا ہے۔ "لالۂ صحرائی" کی تنہائی اور یکتائی کا وہ بھی شریک ہے۔ میرا یہ دعویٰ نہیں کہ اقبال فہمی میں یا اقبال شناسی میں کوئی اس کا ہمسر نہیں۔ ہرگز نہیں۔ لیکن اس کا ابہر وہ پچ سب سے مختلف ہے۔ اس کا ابہر وہ پچ محض عالمانہ اور فلسفیانہ نہیں۔۔ بلکہ اس میں وجدان کی سرشاری بھی ہوتی ہے جو اقبال کی علامت تمنا اور آرزو تھی۔ جو اپنے سخن فہموں سے بار بار یہی کہا کرتا تھا:۔

رختِ جاں بت کدۂ چیں سے اُٹھا لیں اپنا
سب کو محوِ رخِ سعدیٰ و سلیمیٰ کر دیں

اقبال کے مفسرین نے رختِ جاں بتکدۂ چیں سے اُٹھایا ہو کہ نہ ہو اس سے بحث نہیں مگر ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ کسی کو ہم نے محوِ رخِ سعدیٰ و سلیمیٰ ہوتے نہیں پایا۔ اگر آپ چاہیں کہ خود کو محوِ رخِ سعدیٰ و سلیمیٰ کریں تو ایک بار ہی سہی آپا سے اقبال کی شاہکار نظم "مسجد قرطبہ" پڑھیے اور پھر دیکھیے کہ عشق کا ایک سیلِ رواں ہے جو آپ کے سامنے وجود کو کائنات کی ساری پہنائیوں کو اپنے اندر سمیٹتا ہوا اُمنڈتا چلا آ رہا ہے۔ اس کے ہر شعر کی تشریح پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہوتی جائے گی اور جب آپا اس شعر پہ پہنچیں گی

عشق دمِ جبرئیل ، عشق دلِ مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول ، عشق خدا کا کلام

تو یوں محسوس ہوگا کہ جیسے تسنیمِ عشق کی مستی سے آپ کا پیکرِ گِل بھی تابناک ہوتا جا رہا ہے۔ اور اگر آپ چاہیں کہ

بادہ دیرینہ ہو اور گرم ہو ایسا کہ گداز
جگرِ شیشہ و پیمانہ و مینا کر دیں

تو پھر آپا سے اقبال کی وہ معرکے کی نظم "ذوق و شوق" ضرور پڑھیے جو نظم نہیں بلکہ جذبۂ عشق کا آتش فشاں ہے۔ جن خوش نصیبوں کو آپا سے یہ نظم پڑھنے کا شرف حاصل ہوا ہے کچھ وہی اس کی لذت سے آشنا ہوں گے۔ یہی وہ نظم ہے جس کو آپا باوضو ہو کر بڑے احترام اور بڑی احتیاط سے پڑھاتی ہیں کہ ـــ "با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار" والا معاملہ ہے۔ کہیں لغزش نہ ہونے پائے۔

ایک تو اقبال کا جذبۂ عشق ، وارفتگی اور شیفتگی ـــ دوسرے زبان و بیان کی وہ روانی کہ موتیوں کی ڈھلکتی لڑی اور اس پہ تمہید میں اقبال کی ماہرانہ محاکات نگاری ـــ ان سب پر طرفہ آپا کی خوش بیانی ـــ کیا بتائیں کہ ماحول پر کیا سحر آگیں کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ یہی پوسٹ گریجویٹ کالج کی سرمگیں شامیں تھیں۔ بجلی کے قمقمے جواب دے جاتے تو آتش اشراق کی شمعیں روشن کر لی جاتی تھیں ادھر تشریح و توضیح کا دریا ہے کہ اُمنڈتا چلا آ رہا ہے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ریگ نواح کاظمہ واقعی معنوں میں حریر و پرنیاں بن کر ہمارے قدموں تلے سرسرا رہی ہے اور قافلۂ عشاق کی کھوج میں نکل پڑے ہیں ـــ وادیٔ فاراں سے نکل کر مقامِ جبرئیل سے ہوتے ہوئے اور اہلِ فراق کے حصے میں آئی ہوئی عیشِ دوام کی نعمتوں کو بٹورتے ہوئے جب گیسوئے دجلہ و فرات پر پہنچے تو نہ پوچھیے کہ ہمارے وجود کا شیشہ و پیمانہ کس طرح پگھلنے لگا اور کس طرح ہماری روح اس محرومی پہ ماتم کناں ہو جاتی کہ قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں۔

کچھ ایسی ہی سرشاری کی کیفیت ساقی نامہ کے پڑھاتے وقت بھی طاری ہو جاتی تھی۔ کاش آپ نے کبھی آپا سے "دلِ مرتضیٰ اور سوزِ صدیقی" کی تفسیر سنی ہوتی۔ یا پھر اس معنی کے جلووں کو بے حجاب دیکھا ہوتا جو بقول اقبال
محبت میں یکتا حمیت میں فرد ـــــــــــ ۔ آپ کو آپا سے بہت کچھ پڑھنا ہے۔ عشقِ مصطفیٰ بھی اور گلہائے خیال بھی، رام کا پیغام بھی، نانک کا صلائے توحید بھی، حضرت بلال کی جاں نثاری بھی اور سوامی رام تیرتھ کی جاں سپاری بھی ـــ مجھے تو اب

اس مقام سے سرسری ہی گذر جانا چاہیے ورنہ یہاں تو ہر جا جہانِ دیگر ہے۔ بہرحال یہ سمجھئے کہ آپا غالب اور اقبال کا صحیح مذاق پیدا کر دیتی ہیں۔ مجھے ان طالب علموں پر افسوس ہے جو علم و ادب کے اس بحرِ بیکراں کے کنارے رہتے ہوئے تشنہ کام ہیں۔ ان کی کم ہمتی پر مومن کا یہ شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

دامن اس کا جو ہے دراز تو ہو
دستِ عاشق رسا نہیں ہوتا

اور ان طالب علموں اور ریسرچ اسکالرس پر رشک آتا ہے جو روس اور امریکہ جیسے دور دراز مقامات سے یہاں آئے ہیں اور آپا سے کبھی غالب پڑھ رہے تو کبھی حالی، کبھی اقبال تو کبھی نظیر اکبرآبادی، کبھی مخدوم تو کبھی فیض۔ غرض علم و عرفان اور حکمت کی موتیوں سے اپنی جھولیاں بھر رہے ہیں۔

نظم کے علاوہ نثر پڑھانے میں بھی آپا کا ایک منفرد اسٹائل ہے جنھیں آپا سے رشید احمد صدیقی کی گنج ہائے گرانمایہ پڑھنے کا موقع ملا ہے وہ اس کے شاہد ہیں خاص طور پر جب محمد علی جوہر یا "میرے مولانا" کے موقعوں پر لکچر شروع ہوتا تو یوں محسوس ہوتا کہ جیسے رشید احمد صدیقی کے یہ مرثیے پڑھتے جا رہے ہوں اور ہم ان کے پہلو بہ پہلو چل رہے ہوں۔ ایک گنج ہائے گرانمایہ ہی پر کیا موقوف ہے حالی کا مقدمہ شعر و شاعری ہو کہ شبلی کی شعر العجم یا مہدی افادی کی "افاداتِ مہدی" ہو کہ ڈپٹی نذیر احمد کی ابن الوقت، میر حسن کی مثنوی سحرالبیان ہو کہ تاج کی انارکلی، مرزا رسوا کی امراؤ جان ادا ہو کہ منشی پریم چند کی نرملا اور گئودان۔

ڈرامہ پر آپا کا لکچر ایک دستاویزی مقالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لکچر کے دوران ہمیں اندازہ ہوتا تھا کہ اردو کے علاوہ انگریزی اور سنسکرت ادب پر بھی آپا کی نظر کتنی گہری ہے۔ غرض یہ آپا کی ماہرانہ تدریسی صلاحیت ہے کہ وہ ہر خشک سے خشک مضمون کو اتنا ہی دلچسپ بنا کر پڑھاتی ہیں جتنی دلچسپی سے وہ غالب کی اپنی کوئی پسندیدہ غزل پڑھاتی ہوں۔

آخر میں مجھے صرف ایک بات عرض کرنی ہے کہ آپا کی شخصیت میں ہندوستان کی دو اہم تاریخی شخصیتوں کا حسین امتزاج ملتا ہے ایک ترک لاچین اور دوسرے ترک ایبک۔ ترک لاچین یعنی حضرت امیر خسرو اور آپا میں جو قدر مشترک ملے گی وہ ان کی ہندوستانیت ہے۔ یعنی ہندوستان کی ہر وہ چیز جس سے مشترکہ تہذیب پروان چڑھے اور برگ و بار لائے آپا کو اسی طرح عزیز ہے جس طرح حضرت امیر خسرو کو رہی ہے۔ مثلاً یہاں کی مشترکہ زبان، لباس، رہن سہن، رسم و رواج مشترکہ معاشرتی قدریں، یہاں کے موسم، تہوار، پھل، پھول حتیٰ کہ یہاں کا سانولا سلونا محبوب جس طرح خسرو کو اپنے ولایتی گورے چٹے مگر پھیکے محبوب سے زیادہ عزیز تھا اسی طرح آپا کو بھی عزیز ہے۔ یہ قدر مشترک آپا کی شخصیت میں ان کی تحریروں اور تقریروں میں ہر جگہ ہر مقام پر نمایاں بھی ملے گی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسی پہلو دار اور تہہ دار شخصیت کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا جائے اور طالب علموں کے لئے ایسے مواقع فراہم کیے جائیں کہ وہ اپنے عہد کے ایسے مثالی استاد سے زیادہ سے زیادہ مستفیض ہو سکیں۔ ورنہ غالب کی زبان میں ہی زمانہ سے گلہ رہ جائے گا۔

مباش منکر زینت کہ روزمانہ تست

(★★★)

لئیق صلاح

★

(شعبۂ اردو گلبرگہ کالج)

جوں ہی ہائی اسکول میں قدم رکھا کچھ سن گن ایک نام کی ملنے لگی اور وہ نام تھا "زینت آپا" کا۔ بڑی جماعتوں کی لڑکیوں اور بڑی بہنوں کی زبان پر اکثر یہ نام رہا کرتا تھا۔ ویسے آپا کے خاندان کے کچھ افراد مدرسے میں بھی موجود تھے۔ ایک تو اُن کی پھوپھی، سعادت آپا، اور دوسرے اُن کی دو بہنیں خالدہ اور شاہدہ۔ سعادت آپا بے چاری بہت ہی سادہ لوح تھیں، متاثر کن شخصیت نہیں۔ ان کی دونوں بہنوں میں خالدہ بڑی خاموش تھیں۔ البتہ سب سے چھوٹی شاہدہ بہت چھائی ہوئی تھی۔ بے حد نٹ کھٹ اور کچھ کچھ چرب زبان بھی۔ وہ بڑے فخریہ انداز میں کہا کرتی تھی کہ سب لوگ کہتے ہیں، میں بڑی آپا کی طرح ہوں۔ دوسری باتوں سے قطع نظر ایک مماثلت تو واقعی اُس میں ضرور تھی، یعنی وہ بھی گلاب کی شیدائی۔ اُس کے لئے دوستی اور دشمنی کا معیار تھا تو بس یہی۔

شاید ایسا کم ہی ہوتا ہوگا کہ کالج میں قدم رکھنے سے پہلے وہاں کے اساتذہ سے واقفیت ہو جائے لیکن زینت آپا سے میری واقفیت کالج میں داخلہ لینے سے پہلے ہی ہو گئی تھی۔ پھر جل ترنگ نے وہ ترنگ دکھائی کہ نقش اور گہرا ہو گیا۔ یوں تو سب ہی افسانے اچھے ہیں لیکن مجھے سب سے زیادہ متاثر کن "زرد پھول" ـــــــ محسوس ہوا اور خصوصاً اس کے وہ جملے جو درج ذیل ہیں۔

"اس لمحے کسی نے اس کے پاس تحفہ بھیجا۔ ناچتے ناچتے رُک کر اُس نے اپنی سفید انگلیوں سے چاندی کی بڑی ڈبیا کو کھول کر دیکھا تو اُس میں زرد پھول تھا، بندیا کا قمقمہ تھا، ابرک بڑا گلال تھا اور مانگ کا سیندور۔ ایک پرچے پر لکھا تھا "بسنتی کا کمینہ"۔ اُس کی بادامی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ اُس نے بڑی عقیدت سے اپنے جسم پر گلال چھڑکا۔ ماتھے پر بندیا لگائی، زرد پھول کو بالوں میں اڑس لیا۔

اور دوسرے دن جب ماں نے اس کے بیاہ کی بات چھیڑی تو اُس نے انکار کر دیا۔" (جل ترنگ)

خدا خدا کر کے وہ دن آ ہی گیا جب اُس ہستی کو جس کے چرچے صرف زبانوں تک محدود تھے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، پھر بھی کچھ فاصلے تھے، اس لیئے کہ ہمارا مضمون اختیاری اُردو نہیں تھا اور زبانِ دوم کی کلاس وہ نہیں لیا کرتی تھیں، لیکن ساتھیوں سے جو اُن کی مزے دار باتیں سنیں تو نہایت اشتیاق کے ساتھ ان کی کلاس میں جا بیٹھے۔ اگر غیر متعلق طالبات کلاس میں آتیں تو اکثر اساتذہ کو سخت اعتراض ہوا کرتا ہے۔ اس لیئے کہ پڑھنے والوں کی توجہ دوسری طرف مبذول ہو جاتی ہے، مگر یہاں تو سنانے والی اور پڑھنے والا دونوں گم سم ہو جاتے۔ اور کبھی اس نیک نفس انسان نے یہ پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کہ یہ اجنبی چہرے کون ہیں؟ کس لیئے آئے ہیں؟ بس ہمارا تو مشغلہ بن گیا تھا کہ جب فری ہوں اِدھر اُدھر گھومنے پھرنے یا گھر بھاگنے کی بہ جائے ان کی کلاس میں جا بیٹھیں۔

بی۔ اے میں آئے تو مضمونِ اختیاری اُردو بھی تھا، قسمت سے زبان دوم اور مضمون اختیاری دونوں پڑھانے لگیں یہ تینوں کی لڑکیاں اکثر زبانِ دوم کی کلاس میں پابندی سے شرکت نہیں کرتیں، لیکن آپا کی کلاس کا یہ حال ہوتا کہ آخری گھنٹہ ہے اور ہاؤس فل کبھی سائینس روم میں جگہ نہ ملتی تو "آرٹس" ہی کی بلڈنگ میں کلاس ہوتی۔ فرنیچر اور کمرے دونوں کو تنگ دامانی کا احساس ہوتا لیکن پڑھنے والوں کو کیوں کر کوئی چیلنج کر سکتا۔ کرسیاں ناکافی ہوتیں تو میزوں پر چڑھ بیٹھتے۔ اور کمال یہ ہے کہ بعض اُوقات نصاب کی کتاب کی اشاعت کچھ تاخیر سے ہوتی تو اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ تاریخ ادب پڑھاتیں یا کوئی اور کتاب اور ہم کتاب کے بغیر بس ان کا لکچر سننے ہی میں منہمک ہو جاتے۔

پہلی ملاقات کے بعد "تکلف ذرا برطرف" ہوتا گیا۔ وہ ہمیں غالب، گنج ہائے گراں مایہ، شکست اور ہندی پڑھا تی تھیں۔ ہم بڑی شان سے ایک روز بھائی جان کا "دیوان غالب" لے گئے، چغتائی والا۔ اتفاق سے آپا کی نظر پڑ گئی۔ کہنے لگیں کہ بس روز یہی لانا۔ یہ ہو تو غالب کے پڑھانے میں لطف آتا ہے۔ اب چوری سینہ زوری کا روپ اختیار کرنے لگی۔ بھائی جان دینے پر رضامند نہیں اور یہاں نا کہتے بھی نہیں بنتی۔ بہر حال ۔ ۔ ۔ ۔ کیا بنے بات ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ والا معاملہ درپیش تھا کسی نہ کسی طرح لاتے ہی بنی۔

ہم سب کے اصلی ناموں سے زیادہ فرضی نام بہت چلا کرتے تھے۔ مجھے "چاؤش" کہتیں اور میری ایک ساتھی، راشدہ کو، جس نے عربی بھی لی تھی "مولانا"۔ کہتیں کہ فارسی تو ہم کو آتی ہے لیکن، عربی کے مولانا سے ذرا خوف ہوتا ہے۔ کسی بور، کلاس سے آتے تو یہاں کلفت دور ہو جاتی۔ ایک دن غالب پڑھاتے ہوئے جب اس شعر پر پہونچیں ۔

بکنے دو جنوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو

جو مئے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

تو اتفاقاً کلاس کے سامنے سے سلامت آپا برقعہ گزر رہی تھیں تو اُن کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگیں کہ اس شعر کی تشریح انہیں میں مضمر ہے۔ وہ کچھ چیں بہ جبیں ہو کر کہنے لگیں: کیا تم کو کلاس میں بھی مذاق سوجھتا ہے؟ میرا نام لیئے بغیر چین نہیں آتا۔ زینت آپا ہم سے مخاطب ہو کر کہنے لگیں: یہ میری استاد ہیں۔ اب بھی وہ مجھے ڈانٹ پلاتیں اور کان پکڑتی ہیں۔ آج بھی اس شعر کے ساتھ سلامت آپا کا تصور آجاتا ہے۔

غالب کی ایک غزل وہ تقریباً ایک گھنٹے میں مکمل کیا کرتی تھیں۔ ہماری ساتھیوں میں بعض ایسی بھی تھیں، جو چاہتی تھیں کہ ایک گھنٹے میں کئی غزلیں ہو جائیں۔ وہ سمجھنے سے زیادہ نوٹس لینے کی عادی تھیں۔ ادھر آپا نے تشریح شروع کی اور وہ کاغذ قلم سنبھال کر بیٹھ گئیں ان کے برعکس دوسرے پورے انہاک کے ساتھ اُن تشریحات کو سنتے، کچھ سوالات بھی کرتے۔ اس پر بھی طوطے کی طرح رٹنے والوں کو بُرا لگتا کہ خواہ مخواہ بات طویل ہو گئی اور گھنٹہ ختم۔ لیکن جب ٹسٹ یا امتحان ہوتا تو بکواس کرنے والے، بکھنے والوں سے زیادہ نشانات حاصل کرتے۔ غالب کو ہم نے بغیر کسی شرح کے پڑھا اور سمجھا ہے۔ یقیناً یہ زینت آپا کا طفیل ہے۔ تشریح اس قدر مکمل اور مفصل ہوتی کہ تشنگی کا احساس نہیں رہتا۔ معمولی اور روزمرہ کے تجربات و مشاہدات کا سہارا لے کر بڑے بڑے مسائل اور نکتے بیان کر جاتیں۔ ایک اور خوبی اُن کی یہ ہے کہ جس شخصیت کو اُنہوں نے چھوا اس کا نقش طالب علم کے دل پر ثبت ہو گیا۔ غالب، رشید احمد صدیقی، خسرو، رابندر ناتھ ٹیگور، کرشن چندر اور پریم چند کے علاوہ "گنج ہائے گراں مایہ" کی شخصیتیں جیسے ڈاکٹر انصاری، مولانا سلیمان اشرف، مولانا ابوبکر، اور شکست کا دبی کا کردار، ہمارے ذہنوں پر چھائے ہوئے ہیں۔ یہ زینت آپا کے طریق تدریس کا طلسم، ان کے اسلوب بیان کا کرشمہ اور تخلیق و تجزیاتی ذہن کا اعجاز ہے۔

اس دور میں "سیاست" میں آپا کے اکثر مزاحیہ اور طنزیہ انشائیے شائع ہوا کرتے تھے۔ وہ بھی ہم بڑی دلچسپی سے پڑھا کرتے تھے۔ "گندی پیٹ کا پانی" کے عنوان سے ایک مضمون اُنہوں نے سپرد قلم کیا تھا، جس میں اس پانی کی وہ خوبیاں گنائیں کہ شاید سات سمندروں میں بھی نہ ہوں۔ یو۔ پی والوں سے لے کر آندھرا والوں تک سب کو غوطہ زن کر دیا تھی جیسے پیٹ والوں کو توند والے بنا دیا۔ کوٹھیاں اور جھونپڑیاں سب فراموش ہو گئیں۔ اسی طرح "چار مینار پر غلاف" "سید صاحب کا لوکر" اور "کالی جمرات" وغیرہ ایک سے ایک قابل ذکر انشائیے ہیں۔ یہ سارے انشائیے اُنہوں نے قلم برداشتہ لکھے ہیں۔ بعض اوقات ہمارا ٹسٹ ہوتا وہ ہم کو سوال دے دیتیں اور کلاس میں بیٹھے بیٹھے یہ مضمون مکمل کرتیں۔ درمیان میں کچھ محاورے آتے تو ہم سے بطور آزمائش پوچھ بھی لیتیں۔ اس طرح جن محاوروں کے مفہوم کو ہم نہ سمجھتے ہوں، اُن سے آگاہ ہو جاتے۔ ریڈیو پر کچھ پڑھنا ہوتا تو وہ بھی قلم برداشتہ ہی لکھا جاتا۔ بعض اوقات تو ریڈیو اسٹیشن پہونچ کر ہی مضمون پورا ہوتا۔

پڑھنے پڑھانے کے علاوہ دیگر مصروفیات میں بھی بہت دل چسپی لیا کرتی تھیں۔ کلچرل پروگرام کا اُن کے تعاون کے بغیر ہونا نا ممکن تھا۔ فنڈ جمع کرنا ہو تو چلیے سب سے پہلے رسید بک آپا کے ہاتھ میں آ گئی۔ خوش دلی سے دینے والے اور پس و پیش کرنے والے دونوں بلا تامل ٹکٹ خرید لیتے۔ کبھی کبھی ہم چھیڑنے کے لئے کہتے: آپا یہ ذمہ داری آپ ہی کے سر کیوں ہو جاتی ہے؟ تو بہت ہی دل نشین انداز میں مسکراتے ہوئے جواب دیتیں: "اللہ ہم کو ایک نیلان کی ساڑی اور ویلٹ کا بلوز بنانا ہے"۔ ہم لاجواب ہو جاتے۔ پھر کہتیں تم لوگوں کی طرح میرے بعض دوست احباب بھی یہی کہتے ہیں۔ جب بھی میں کسی کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہوں، دروازہ کھلتے ہی پہلا سوال یہ ہوتا کہ ملنے آئی ہو تو چشم ما روشن دل ما شاد" لیکن چندے کے لئے آئی ہو تو معاف کرنا۔ اتنی کھری کھری سننے کے بعد بھی وہ اپنے فرض سے غافل نہ ہوئیں۔" دامے درمے سخنے" ضرورت مند کی مدد کرنا اُن کا گویا اولین فریضہ ہے۔

مدرسے سے کالج اور کالج سے یونیورسٹی تک طالب علموں کو بہت سے ہاتھ بناتے سنوارتے ہیں، لیکن اُن میں سب نہیں صرف

چند ہی شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو واقعی کوئی پیکر تراشتی ہیں۔ اُن میں سے ایک آپا ہیں۔ میر، غالب، اور ابوالکلام آزاد جب پڑھاتیں تو انانیت صرف مضمون ہی کی حد تک نہیں رہ جاتی بلکہ پڑھنے والے کی شخصیت میں بھی موجزن ہو جاتی اور وہ عمر بھر اس "انا" کی تشکیل اور اس کی حفاظت میں لگا رہتا۔ ان کے بعض بعض جملے اب بھی ذہن میں گونجتے ہیں، جیسے دشمن مقابل کا ہو تو خدشہ نہیں، لیکن اپنے سے کم تر ہو تو بہت خطرناک ہوتا ہے۔ جس اوچھے طریقے سے وہ حملہ کرتا ہے، ہماری شرافت اجازت نہیں دیتی کہ ہم بھی اُس سطح تک اُتریں۔

یہ تو رہی پڑھنے، پڑھانے کی باتیں، جب پکنک میں ساتھ ہوتا تو رنگ کچھ اور نکھر آتا۔ اُن کے بغیر کوئی پکنک کا تصور ہی نہیں کر سکتا تھا۔ کبھی ایک ساتھ دو کلاسس پکنک پر جانے کا پروگرام بنالیتیں تو بڑی اُلجھن پیدا ہو جاتی۔ ہر ایک یہی چاہتا کہ آپا اُن کے ساتھ چلیں۔ بات بڑھتے بڑھتے لڑائی تک جا پہونچتی۔ دونوں فریق فریاد لے کر انہیں کی خدمت میں پہونچے اور وہ بڑے اطمینان کے ساتھ فیصلہ سناتیں، جس کلاس نے اُنہیں پہلے مدعو کیا ہے وہ اُنہیں کے ساتھ جائیں گی۔ دلچسپ اور مزیدار باتیں ہوتیں، پوری پوری آزادی کے ساتھ، ڈھولک کے گیت ہوتے، پانی کھیلا جاتا، غرض پورا دن آپا کے ساتھ گزارنے کے بعد بھی طبیعت سیر نہ ہوتی۔

غالب پڑھاتے پڑھاتے، سادگی و پرکاری کو اُنہوں نے اپنا شعار بنالیا ہے۔ بہت ہی بے تکلفی سے جب گفتگو ہوتی تو ہم اُن کی حد سے بڑھی ہوئی سادگی پر دبی زبان سے اعتراض کرتے۔ وہ ہنس کر ٹال جاتیں۔ ایک دفعہ کہنے لگیں۔ میں نے مشورہ دیا کہ کبھی کبھی میک اپ بھی کر لینا چاہیئے۔ کچھ دن بعد ہماری بات کو دہراتے ہوئے کہنے لگیں۔ تمہارے مشورے پر ہم نے ایک دفع عمل کیا لیکن جب آئینے کے سامنے گئے تو یوں محسوس ہوا کہ وہ "ہم" نہیں ــــ

ابھی ابھی "پریم چند صدی تقاریب" کے سلسلے میں اُنہیں ایک سائنس کالج میں مدعو کیا گیا تھا۔ کسی سفر سے واپس آئی تھیں، بہت ہی تھکی ماندی۔ پروگرام کچھ اس طرح تھا، ایک ہندی کا مقرر، ایک تلگو کا اور ایک اردو کا۔ آپا کا نام درمیان میں تھا لیکن تلگو والے مقرر نے کہا کہ ان کو سننے کے بعد مجھے کوئی نہیں سُنے گا۔ اس لیئے آپا کو آخر میں رکھا جائے۔ ہندی کے مقرر نے پریم چند کے کرداروں کے بارے میں سیر حاصل تقریر کی۔ تلگو کے مقرر نے پریم چند کے فن اور موضوعات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اب آپا کے کہنے کے لیئے کچھ نہ رہا، لیکن اُنہوں نے "پریم چند" کے ناولوں کے نفسیاتی جائزے پر وہ دھواں دار تقریر کی کہ ہر ایک یہ محسوس کرنے لگا کہ ــ

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔

ہندی کے لیکچرار نے تقریر ختم ہوتے ہی کہا، آپا ایسا لگا کہ آپ نے میری محرومی کو اس کردار میں بیان کیا ہے۔ سائنس کالج میں کسی ادبی جلسے کے لیئے طلبہ کا اکٹھا ہونا معجزے سے کم نہیں۔ لیکن اس جلسے میں طلبہ کا بڑا ہجوم تھا۔ آپا کی تقریر طویل تھی، لیکن اس کے باوجود کوئی پہلو [illegible] نہیں بدلا۔ ایسا لگتا تھا کہ کسی نے مجمع پر جادو کر دیا ہے۔ ہر ایک ہمہ تن گوش تھا، البتہ وقفے وقفے سے کسی جملے یا فقرے کی داد کی خاطر تالیاں بجتی رہیں۔ پوری تقریر کے دوران بس فضا کچھ ایسی تھی، وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔

اسی کالج میں انگریزی کے ایک لیکچرر ہیں جو بہت کم کسی کی تعریف کرتے ہیں اور اردو کو دیسی لسان کہتے ہیں، لیکن آپا کا

جادو ان پر بھی چل کر رہا۔ ان محروموں سے جو آپا کی تقریر نہ سُن سکے تھے دوسرے دن اپنے مخصوص انداز میں انگریزی میں کہنے لگے اگرچہ وہ خاتون اپنی وضع قطع سے پروفیسر نہیں لگتی تھیں لیکن ان کی تقریر سے پتہ چلا کہ وہ بڑی اسکالر اور بے مثال خطیب ہیں۔

ضروری نہیں کہ اچھا انشا پرداز اچھا مقرر بھی ہو لیکن آپا قلم اور زبان دونوں سے جادو جگاتی ہیں۔ اُن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ بے محابا بولتی ہیں، بڑے لطیف نکتے پیدا کرتی ہیں اور اپنے خیالات کے اظہار میں بے باک اور نڈر ہیں۔ چند سال قبل فیض احمد فیض ایک عرصے کے بعد حیدرآباد آئے تو انجمن ترقی پسند مصنفین اور انجمن ترقی اردو کی طرف سے اُردو ہال میں اُن کے شایانِ شان خیر مقدم کیا گیا۔ تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ افتتاحی تقریر آپا کی تھی۔ اُنہوں نے فیض کی شخصیت اور اُن کے فن کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا: "پہلے کے شعرا فارسی میں عشق کیا کرتے تھے اور اُردو میں شاعری لیکن فیض نے انگریزی میں عشق کیا اور اُردو میں شعر کہتے ہیں"۔ اس جملے کی بے پناہ داد ملی اور اُردو ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔ فیض بھی دیر تک اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے اور لطف اندوز ہوتے رہے۔

پریم چند صدی تقاریب کا آخری جلسہ تھا جس کا افتتاح اُس وقت کے چیف منسٹر ڈاکٹر ایم چناریڈی نے کیا تھا۔ چیف منسٹر کی تقریر کے بعد ہی آپا کی تقریر تھی۔ آپا کو اندازہ تھا کہ چیف منسٹر زیادہ دیر نہیں ٹھہریں گے۔ انہیں یہ گوارا نہ تھا کہ اُن کی تقریر کے دوران چیف منسٹر جائیں اور ان کی تقریر کا سلسلہ ٹوٹے۔ اس لیئے اُنہوں نے چیف منسٹر پر نظر ڈالی، جو پر تول رہے تھے اور کہا: میں منتظمین جلسہ کو متنبہ کر دیا کرتی ہوں کہ جہاں وزرا آئیں وہاں میری تقریر نہ رکھا کریں۔ اس لیے کہ ایسے جلسوں میں بعض ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو میری تقریر سُننے کے لیئے نہیں وزیر صاحب کے درشن کے لیئے آ جاتے ہیں اور جلسے کی کارروائی کے دوران جب وزیر صاحب کسی سرکاری اور ضروری کام کی وجہ سے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو یہ لوگ بھی اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں، تا کہ ان کی حاضری نوٹ کر لی جائے! اس سے کچھ دیر کے لیئے جلسہ کی کارروائی رک جاتی ہے اور مقرر بدمزہ ہو جاتا ہے۔ پھر آپا نے چیف منسٹر کو مخاطب کر کے کہا کہ اگر آپ کو کسی کام سے جانا ہو تو براہِ کرم میری تقریر شروع ہونے سے پہلے ارادہ کریں تا کہ میں یکسوئی کے ساتھ تقریر جاری رکھ سکوں۔ چیف منسٹر رک گئے اور آپا نے تقریر شروع کی۔ کوئی دس پندرہ منٹ بعد چیف منسٹر پہلو بدلنے لگے۔ آپا کی نظر پڑی تو چیف منسٹر کو مخاطب کر کے کہا، آپ تکلف کر رہے ہیں۔ میں دو منٹ کے لیئے رکتی ہوں، آپ سدھاریں۔

ڈاکٹر چناریڈی مردِ آہن مانے جاتے ہیں اور بڑے دبدبے کے آدمی ہیں۔ اُن کے سامنے منہ کھولتے ہوئے اچھے اچھے گھبراتے ہیں۔ یہ آپا کا دل تھا کہ بھرے جلسے میں صاف گوئی سے نہ چوکیں۔

مخدوم ایوارڈ کے جلسے میں بھی کچھ ایسی ہی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ یہ زمانہ وہ تھا جب کہ چناریڈی حکومت کی جڑیں کھوکھلی ہو رہی تھیں۔ آپا صدر مخدوم اوارڈ کمیٹی کی حیثیت سے خیر مقدمی تقریر کر رہی تھیں۔ اُنہوں نے کہا: ڈاکٹر صاحب کے بارے میں آجکل دو رائیں پائی جاتی ہیں۔ کوئی انہیں اچھا آدمی کہتا ہے اور کوئی بُرا لیکن میں نہیں جانتی کہ وہ اچھے ہیں یا بُرے۔ اس لیئے کہ اُن سے کبھی سابقہ نہیں پڑا۔ کبھی کسی غرض سے اُن کے ہاں گئی نہیں۔ ہاں میرا اور اُن کا ایک رشتہ ہے اور وہ ہے اردو کا رشتہ۔ وہ عثمانین ہیں، اردو والے ہیں اور اردو کے لیئے کچھ کام بھی کیئے ہیں۔ اس لئے میں سمجھتی ہوں وہ اچھے آدمی ہوں گے۔ تو ڈاکٹر چناریڈی نے اپنی تقریر

کے دوران زینت آپا کو مخاطب کرتے ہوئے یقین دلایا کہ وہ اچھے آدمی ہی ہیں لیکن ؎

ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں۔

آپا کی اُسی حق گوئی اور بے باکی کا اعتراف کرتے ہوئے ہیں جلسے میں باگاریڈی صاحب نے اُنہیں پولیس پٹیل کا خطاب دیا تھا۔

متذکرہ بالا دونوں واقعات کے حیدرآباد میں بڑے چرچے رہے۔ ایک محفل میں آپا کی جرات اور بے باکی کی ستائش کرتے ہوئے ان واقعات کا ذکر کیا گیا تو آپا نے انتہائی انکساری سے جواب دیا، اس میں میری نہیں ڈاکٹر چناریڈی صاحب کی بڑائی ہے۔ حق بات کہنا آسان ہے لیکن حق بات سُننا بہت مشکل ہے۔ اس کے لئے بڑے دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ بھی آپا کی حق گوئی کی ایک مثال ہے جو پہلی دو مثالوں سے کچھ کم اہم نہیں۔

اُستاد اور شاگرد کے تعلقات عموماً کالج اور یونیورسٹی کی حد تک رہا کرتے ہیں۔ بہت کم اُستاد ایسے ہوں گے جن سے ان کے شاگرد کالج چھوڑنے کے بعد بھی تعلقات استوار رکھتے ہوں۔ انھیں میں سے ایک آپا ہیں۔ آج بھی پُرانے سے پُرانا شاگرد بھی اُن سے اُسی خلوص اور عقیدت سے ملتا ہے۔ خواہ وہ ہندوستان میں ہوں کہ ہندوستان سے باہر، اور کمال یہ ہے کہ شاگردوں کے گھر والوں سے جب اُن کا تعارف ہوتا ہے تو بلا لحاظ مردانہ و زنانہ، چھوٹے بڑے سب ہی ان کے گُن گانے لگتے ہیں۔ دادی اماں امی، بابا، بھائی، بہنیں اور نوکر چاکر، سب کے لیئے ان کی شخصیت قابلِ احترام بن جاتی ہے۔ بزرگوں کا ساتھ ہوا تو خاص آداب ملحوظ رکھتی ہیں۔ بے تکلف لوگوں میں بیٹھتی ہیں تو رنگ کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ بچے سمجھتے ہیں کہ اُن کو سب پر فوقیت دی جا رہی ہے نوکر اس لئے خوش کہ اُن کا حال پوچھا جا رہا ہے۔ اُن کی شخصیت میں ایسی موہنی اور اُن کی باتوں میں ایسی اپنائیت اور اُن کے طور طریق میں ایسی جاذبیت ہے کہ پڑھا لکھا اور اَن پڑھ، کوئی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ خوشی کا موقع ہو تو سب سے پہلے موجود رہیں گی۔ شاگرد اپنی اور اپنے بھائی بہنوں کی شادیوں ہی میں نہیں اپنے بچوں کی شادیوں میں بھی انھیں فراموش نہیں کرتے۔ کوئی پریشانی اور دُکھ ہو تو وہ اس کے ہاں پہونچ جائیں گی اور اس کی غم گساری میں لگ جائیں گی۔ تعزیت، بقول غالب "ایک کا کلیجہ پھٹ گیا اور لوگ کہتے ہیں کہ صبر کرو" والے انداز میں نہیں بلکہ ایسے ہمدردانہ انداز میں کریں گی کہ دل کو ڈھارس بندھ جائے۔ اور جتنی دیر وہ ساتھ رہیں گی دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔

ڈاکٹر محمد حسین نے اپنے ایک انٹرویو میں بتلایا تھا کہ ڈاکٹر اعجاز حسین اپنے شاگردوں سے اتنے قریب رہتے تھے کہ وہ بلا تکلف اپنے سارے خانگی مسائل اُن سے بیان کر دیتے تھے اور اُن سے مشورہ طلب کرتے تھے۔ آپا بھی اسی طرح اپنے شاگردوں کے مسائل سے دلچسپی لیتی ہیں اور ہر معاملے میں انہیں ان کا بھرپور تعاون حاصل ہوتا ہے کئی لوگ شادی بیاہ کے رشتے بھی اُنہیں کے ذریعہ طے کرواتے ہیں۔ ایک تو حلقہ وسیع، دوسرے اُن کا خلوص منٹوں میں معاملات طے ہو جاتے ہیں۔

عموماً لوگ بڑوں کی باتوں کو غور سے سُنتے اور پڑھا کرتے ہیں تاکہ کچھ معلومات میں اضافہ ہو لیکن آپا کی یہ خاص بات ہے کہ کوئی معمولی شاعر، افسانہ نگار، اور انشاپرداز بھی جب اپنی کوئی نئی تخلیق اُن کو سُناتا ہے تو وہ بڑے انہماک اور دلچسپی سے سنا کرتی ہیں اور غلطیوں کی کچھ اس انداز میں تصحیح کرتی جاتی ہیں کہ سنانے والے کو گراں نہ گزرے بلکہ اس میں اعتماد اور حوصلہ

پیدا ہوتا جائے۔

ایک اور بات جس کا احساس جب نہیں بلکہ آج ہو رہا ہے کہ اُنہوں نے ہم کو اپنی تہذیب، اپنی اقدار، اور اپنی روایتوں سے پیار کرنا سکھایا، ورنہ بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ ہمیں اپنی روایتیں فرسودہ محسوس ہونے لگی تھیں۔ جب کوئی بدیسی طالب علم یا اسکالر ہماری تہذیب کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے آتا ہے تو وہ اس کی مدد اپنا فرض منصبی سمجھ کر اس کو اپنے ساتھ لئے لئے پھرتی ہیں اور ایسے ایسے مقامات پر لے جاتی ہیں، جہاں اس کی تشنگی ہی دور نہیں ہوتی بلکہ وہ سیراب ہو جاتا ہے۔

کالج کے دور میں میں نے اپنے استادوں پر ایک مضمون لکھا تھا جس میں آپا کے بارے میں نے یہ تحریر کیا تھا کہ "غبارِ خاطر" اور "بارِ خاطر" کی شخصیتیں یک جا ہوگئی ہیں۔ چائے شوق سے پیا کرتی ہیں اور پان بھی اشتیاق سے کھاتی ہیں۔ جہاں مولانا آزاد کی سنجیدگی، بلندی تخیل و تفکر ہے، وہیں شوکت تھانوی کی ظرافت اور بذلہ سنجی بھی موجود ہے۔ یہ امتزاج بہت کم شخصیتوں میں پایا جاتا ہے۔ اُن کی شخصیت کو "آئینہ تمثال دار" کہیں تو مناسب ہے۔ میں آج بھی اپنے ان خیالات پر قائم ہوں۔

حفیظ النساء حزیں

(باغ جہاں آرا یاقوت پورہ)

ہدیۂ تہنیت

(محترمہ ڈاکٹر زینت ساجدہ صاحبہ کے جشن کے موقع پر)

دے رہا ہے جشن یہ پیغام زینت ساجدہ
آپ ہیں قدرت کا اک انعام زینت ساجدہ

کہہ رہے ہیں اہلِ دل اہلِ نظر اہلِ قلم
ہے ہماری راہبر کا نام زینت ساجدہ

جذبۂ اخلاص سے معمور جس کی زندگی
مہر و الفت کا چھلکتا جام زینت ساجدہ

مظہرِ لطف و عنایت مخزنِ علم و ادب
پیکرِ حسنِ عمل کا نام زینت ساجدہ

دیکھتے ہیں چشمِ حیرت سے جسے گنگ و جمن
علم کا ساگر ادب کا نام زینت ساجدہ

اتنی شہرت ہو تری ہندوستاں کا ذکر کیا
لینے آئیں درس اہلِ شام زینت ساجدہ

زینتِ علم و ادب بھی زینتِ محفل بھی ہے
دیدہ و دل میں منور نام زینت ساجدہ

ہے پرستارانِ زینت میں حزیں کا نام بھی
یہ بھی ہے اک بندۂ بے دام زینت ساجدہ

مدرد ہال میں کوئی تقریب تھی۔ اسٹیج پر ہر چیز قرینے سے سجی تھی۔ ایک مستطیل میز — خوبصورت میز پوش، اس پہ رکھے گلدان — کرسیاں اور اُن پر سج دھج کر بیٹھے ہوئے اکڑے اکڑے لوگ — یہ سب اسٹیج کی زینت بڑھا رہے تھے، لیکن ان وجاہت کار معززین میں ایک محترمہ ایسی بھی تھیں جو اس زینت کا حصہ بالکل نہیں لگ رہی تھیں۔ سادہ لباس، اُلجھے اُلجھے بال، چہرے پہ شانِ بے نیازی — مسلسل باتیں کیے جا رہی تھیں کسی نے بتایا یہی زینت ساجدہ ہیں۔

تقریریں ہوئیں۔ وہی رٹے رٹائے سے جملے — چہروں کے یکساں اُتار چڑھاؤ — ہونٹوں کے خاص زاویے — ہاتھوں کی مخصوص جنبش —

پھر وہ اُٹھیں جو اس زینت کو مجروح کر رہی تھیں۔ بولنا شروع کیا — میں حیرت سے دیکھتا ہی رہ گیا۔ یہ کیسی یونیورسٹی کی استاد ہیں، جن کے چہرے پر غازہ نہیں، ہونٹوں پر سرخی نہیں — نہ لباس میں اہتمام کیا گیا ہے اور نہ ہی کوئی زیور ہے — بات کر رہی ہیں تو فطری انداز میں — ہونٹوں کے زاویے بناوٹی انداز میں بنتے اور بگڑتے نہیں جا رہے ہیں۔ خوبصورت

بیگ احساس

زینت آپا

لفظوں کی تلاش میں لہجہ اُلجھا اُلجھا ہوا بھی نہیں — وہ روایتی تقریر ہرگز نہیں تھی۔ بلکہ یوں لگتا تھا وہ اپنے گھر کی کسی تقریب میں بیٹھی باتیں کر رہی ہوں۔ وہاں ہال میں بیٹھے سارے لوگ ان کے اپنے ہوں کوئی غیر نہ ہو۔ ہاں لہجہ میں ہلکا سا تیکھا سا انداز ضرور تھا جو خود اعتمادی کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے۔ مجھے زینت آپا اچھی لگیں، اور بھلی لگیں۔

اس کے بعد میں نے زینت آپا کو مختلف جلسوں میں دیکھا، لیکن اُن سے ملاقات کرنے یا بات چیت کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اُن دنوں یہ گمان بھی نہ تھا کہ ان سے ایم اے کرنے کا موقع نصیب ہوگا۔ لیکن قسمت نے ایسا موقع فراہم کر دیا تو زینت آپا سے پڑھنے کی خواہش شدت سے جاگی۔

پہلے سال آپا کی آمد کی صرف خبریں ہی آتی رہیں وہ نہیں آئیں۔ لیکن بعض اچھے اساتذہ کا ساتھ رہا۔ پھر سال ختم ہوتے ہوتے حفیظ قتیل صاحب بھی آ گئے — پھر سراج الدین صاحب جیسے اُردو نواز انگریزی کے اُستاد پرنسپل بن گئے۔ ماحول بڑا خوشگوار تھا۔

سال اول ختم ہوا اور سال آخر کی ابتدا ہوئی تو ماحول کافی مکدر ہو گیا تھا

محمد شطاری صاحب وظیفہ پر علاحدہ ہو گئے تھے۔ حفیظ قتیل صاحب کو بھی اگلے سال جانا تھا وہ بھی نظم و ضبط کے مسائل میں

اُلجھنا نہیں چاہتے تھے ۔ اس لیے تخریب پسند قوتوں کو اچھا موقع ہاتھ آیا ۔ سالِ اوّل کے نئے طالبِ علم آئے تو ایک عجیب سے سیاسی گھناؤنے کھیل کا آغاز ہوا ۔ ان خطرناک حالات میں آپا ایوننگ کالج آئیں ۔

بہت سے اساتذہ نے یہ سوچ کر نوٹس تیار کر رکھے تھے کہ ایوننگ کالج میں پڑھنے والے اکثر طلبا چونکہ دن میں کہیں نہ کہیں مصروف ہوتے ہیں اس لیے لائبریری وغیرہ سے صحیح طور پر استفادہ نہیں کر سکتے ۔ اس لیے ان طلبا کی سہولت کی خاطر اساتذہ نے نوٹس لکھوانا شروع کر دیا تھا ۔ چنانچہ کلاس کی ایک بڑی تعداد کورس میں شامل کتابوں کو دیکھنے کی سعادت سے بھی محروم رہی ۔

آپا نے کبھی نوٹس نہیں لکھوائے ۔ ہاں لیکچر بے انتہا جامع دیتیں ۔ خصوصیت سے مراۃ الشعراء ، جس کے بارے میں یہ بات مشہور تھی کہ کتاب دیکھے اور پڑھے بغیر ہی کمیٹی نے اسے نصاب میں شامل کر لیا ہے ۔ کیونکہ ایک عرصے سے وہ آؤٹ آف پرنٹ تھی ۔ طلبا کو یہ ہدایت کر دی جاتی کہ اگر ممتحن مراۃ الشعراء کے بارے میں کوئی سوال شامل کر دے تو اسے چوائس میں چھوڑ دیا جائے ۔

اسی سال اُتر پردیش اُردو اکیڈیمی نے مراۃ الشعر شائع کی ۔ آپا نے مراۃ الشعر پڑھانے کی ٹھان لی ۔ رات کے گیارہ بج جاتے ۔ اکثر طالبعلموں کی ایسی حالت ہو جاتی جیسے نیا نیا نمازی ایک شبی شبینہ میں پھنس گیا ہو ۔ لیکن آپا کے خشوع و خضوع اور شوقین طلبا کی دلچسپی میں کوئی فرق نہ آتا ۔

ادھر خان صاحب (چوکیدار) بے چینی سے ٹہلنے لگتے کہ اُردو کی کلاس بند کر کے گھر کی راہ لیں ۔ ایسے میں آپا خان صاحب سے اپنے لیے ایک چائے منگواتیں اور تازہ دم ہو کر پھر سے پڑھانے لگتیں ۔ یہ خان صاحب کے لئے ایک اشارہ تھا کہ چاہو تو ایک نیند لے سکتے ہو ۔

آپا کلاس ختم کر کے باہر نکلتیں تو چاند سر پہ آ گیا ہوتا ۔ گھر جانے کے لئے کوئی آٹو رکشا نہیں ملتا ۔ ایسے میں ہمارا ایک دوست کام آتا ، جس نے اسی سال موٹر سائیکل خریدی تھی ۔ وہ بڑے انکسار کے ساتھ اپنی خدمات پیش کرتا ۔ اس کے ذہن میں کہیں یہ بات پوشیدہ تھی کہ استاد کی خدمت کا صلہ ضرور ملتا ہے ۔ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا رہا کہ آپا اسے اپنے پرچے میں نمبر دینے میں خاص رعایت برتیں گی ۔ لیکن بہت جلد اس کی خوش فہمی کا طلسم ٹوٹ گیا ۔ کیونکہ آپا پرچے جانچتے وقت رول نمبر نہیں دیکھتیں ۔

خدا بعض انسانوں کو بناتے وقت اُن کے خمیر میں کسب کی ایک بوند بھی ملا دیتا ہے اور ایسے انسان اپنے پیشے کی علامت بن جاتے ہیں ۔ آپا بھی ایک ایسی ہی علامت تھیں ۔ استاد کے تمام اوصاف گنوانے کے بجائے صرف ایک نام "زینت ساجدہ" لکھ دیا جائے تو استاد کی اس سے اچھی، جامع اور مختصر تعریف نہیں ہو سکتی ۔

اور اس کے برخلاف قدرت کبھی کبھار بڑی ستم ظریفی سے بھی کام لیتی ہے ۔ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اپنے پیشے کی ضد ہوتے ہیں ۔ کبھی محکمۂ پولیس میں مرنجان مرنج قسم کے شریف آ جاتے ہیں اور کبھی یونیورسٹی میں پولیس والے جیسے استاد ۔ شاید انھیں کی وجہ سے یونیورسٹی کی فضا مکدر ہو جایا کرتی ہے ، ہنگامے ہوتے ہیں ، گروپ بندیاں ہوتی ہیں ، دھمکیاں اور جوابی دھمکیاں دی جاتی ہیں ، بار بار عواقب و نتائج بھگتنے کے لئے تیار رہنے کی وارننگ دی جاتی ہے اور کبھی کسی طالب علم کو رگیدا جاتا ہے اور کسی رفیق کو گھسیٹتے ہوئے پرنسپل کے چیمبر تک لے جانے کی کوشش بھی کی جاتی ہے ۔ پرنسپل کا کمرہ طلبا سے بھر جاتا ہے ۔

سال آخر یہی سب کچھ ہوتا رہا ۔ زینت آپا کی ساری ہمدردیاں طالبعلموں کے ساتھ تھیں ۔ اس کے باوجود انھوں نے ہمیں ایسے کسی بھی اقدام سے باز رکھا جو اساتذہ کے خلاف ہو ۔ وہ ہمیشہ روکتی رہتیں ۔ ہر اشتعال انگیزی کا جواب صبر سے دینے کی تلقین کرتی رہتیں ۔ اور اپنے پیشے کے وقار کی حفاظت کرتی رہیں ۔ ہم نے تعلیم پوری کی اور نکل آئے ۔ خدا کے فضل سے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچ سکا لیکن آپا کو اپنی نیکیوں کا

"کفارہ" ادا کرنا پڑا۔

میں نے آپا کو کبھی ناغہ کرتے نہیں دیکھا۔ وہ اکثر نظام کالج میں ٹھہر جاتیں اور ایوننگ کالج کا وقت شروع ہونے پر ادھر چلی آتیں۔ ایک دن راستے میں مل گئیں۔ چہرے پر اضمحلال کی کیفیت تھی۔ وہ شگفتگی بھی نہیں پائی جاتی تھی جو ان کی شخصیت کا حصہ ہے۔ میں نے دریافت کیا تو کہنے لگیں کہ ان کا لڑکا جو علی گڑھ یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہے اپنی آنکھ زخمی کر بیٹھا ہے۔ ممکن ہے آپریشن کرنا پڑے۔ آپا تو سب میں ممتا بانٹتی پھرتی ہیں۔ سب کے لئے تڑپتی ہیں۔ وہ تو ان کا اپنا لڑکا تھا۔ لیکن آپا نے اس روز بھی کلاس لی۔ کسی کو گمان تک نہ ہو سکا کہ وہ اندر سے کتنی منتشر ہیں۔ اس روز بھی انھوں نے ہمیشہ کی طرح پڑھایا گھر جانے کے لئے ایک منٹ پہلے بھی نہیں اٹھیں۔

مجھے حیدرآباد یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کرنے کے لئے داخلہ مل گیا تو بہت خوش ہوئیں مجھے نصیحت کی کہ میں ۲۴ گھنٹوں کا دن بنالوں اور محنت کے ساتھ مقالہ لکھوں۔ ڈاکٹر گیان چند کے میرے گائیڈ ہونے پر بھی انھیں بڑی مسرت تھی۔ مالی مسائل سے نپٹنے کی بہت سی راہیں بتائیں۔ لیکن اتفاق سے ان دنوں مجھے ایک نیم ادبی فلمی رسالے میں بطور سب ایڈیٹر ملازمت مل گئی۔

میری کتاب "خوشۂ گندم" شائع ہوئی تو میں نے رسم اجراء کے سلسلے میں آپا سے مشورہ کیا۔ انھوں نے شدید مخالفت کی۔ انھیں دنوں پروفیسر گیان چند کا ایک مضمون "میری تعریف کرو" سیاست میں شائع ہوا۔ اس مضمون کو پڑھنے کے بعد میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ میں اس مضحکہ خیز رسم کے اہتمام کا مرتکب نہیں ہوا اور پروفیسر گیان چند صاحب کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچ گیا۔

آپا اپنے طالب علموں کے لئے کتنی فکرمند رہتی ہیں اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔

حیدرآباد یونیورسٹی میں داخلے بند ہونے اور سلسلہ تدریس شروع ہونے کے بعد ڈاکٹر مجاور حسین رضوی صاحب نے یونیورسٹی جوائن کی۔ ان سے پہلی دفعہ ملاقات ہوئی تو اور بہت سی باتوں کے بعد کہنے لگے۔ "دیکھو بیٹا۔ ایم اے تک بہت عشق کر لیا۔ اب یہاں عشق کے چکر میں بالکل نہ پڑنا۔" میں سخت حیران ہوا کہ مجاور صاحب تو مجھ سے پہلی بار مل رہے ہیں پھر انھیں میرے نامۂ اعمال کا پتہ کیسے چل گیا۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ ایک بار شعبہ کی تمام لڑکیاں جمع تھیں کوئی پکنک کا پروگرام طئے ہو رہا تھا۔ اچانک ہی مجاور حسین صاحب نے باواز بلند یہ احتیاطی اعلان فرمایا کہ میں نہ صرف شادی شدہ ہوں بلکہ (اس بے احتیاطی پر) کثیر العیال باپ بھی کہلایا جا سکتا ہوں۔ اس طرح مجاور صاحب نے اپنے تئیں ایک فرض ادا کر دیا۔

بعد میں پتہ چلا کہ ڈاکٹر مجاور حسین رضوی کو آپا نے مجھ پر نگران مقرر کیا تھا۔

آپا کا قد اتنا اونچا ہے کہ مقابل کا آدمی خواہ مخواہ ہی احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ شاید اسی لئے انھیں یونیورسٹی سے دور نظام کالج پر متعین کیا گیا ہے جہاں وہ انگلش میڈیم کے طلباء میں، جن کے ذہنوں میں اردو کی روایت اور تہذیب کا کوئی تصور نہیں ہوتا، اردو کی تبلیغ کرتی ہیں۔ کسی مذہبی مشن کے راہبوں کی طرح۔ انھیں نئے نئے تدریسی طریقے برت کر اردو پڑھنے کی طرف مائل کرتی ہیں۔

آپا کی خوبیوں نے میری آنکھیں چندھیا دی ہیں۔ ان چندھیائی ہوئی آنکھوں سے بھی مجھے ان کی کمزوریاں نظر آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ ہر ایک کو قریب کر لیتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ کسی سے نفرت نہیں کر سکتیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ راست باز ہیں، کوئی بات بری لگے تو اس کا اظہار کر دیتی ہیں۔ اس سے سامنے والا شخص ان کا دشمن ہو جائے تو ہو جائے وہ راست بازی سے باز نہیں آتیں۔ نفرت نہیں پال سکتیں۔ آپا کے مذہب میں ڈپلومیسی اور مصلحت حرام ہے۔ میرے خیال سے یہی ان کی کمزوریاں ہیں۔ ایسا بھی کیا آدمی جو نفرت نہ کرے اور مصلحت سے کام نہ لے۔

ایک اور برائی بھی ہے ـــ آپا ترقی پسند ہیں، کمیونسٹ گروپ سے قریب ہوتے ہوئے بھی پکی اور سچی مسلمان ہیں، سید زادی ہونے پر فخر کرتی ہیں۔ اس بات پر تاسف بھی کرتی ہیں کہ مسلمانوں میں ایسی شخصیتیں کم ہوتی جا رہی ہیں جو شفقت اور محبت سے لوگوں کو گرویدہ بنا سکیں۔

مسلمان خلفاء نے عدل و انصاف کی مثالیں قائم کی تھیں۔ مثلاً یہی کہ اگر خلیفہ کو سفر پر جانا ہوتا تو جتنی دیر وہ خود اونٹ کی پیٹھ پر سوار رہتا غلام نکیل تھامے چلتا۔ اتنی ہی دیر تک غلام اونٹ کی پیٹھ پر سوار ہوتا اور خلیفہ نکیل تھامے چلتا۔

بیت المقدس کی فتح کے بعد حضرت عمرؓ شہر میں داخل ہوئے تو ان کا غلام اونٹ کی پیٹھ پر سوار تھا اور آپ نے اونٹ کی نکیل تھام رکھی تھی۔ کیونکہ وہ وقفہ غلام کے اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھنے کا تھا۔

آپا بھی ایک عرصہ سے اونٹ کی نکیل تھامے چل رہی ہیں۔ اب خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ انہیں اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھنے کا موقع بھی ملتا ہے یا نہیں ـــ یا اگر موقع ملتا ہے تو اس سے استفادہ بھی کریں گی یا نہیں ـــ یا پھر اس صحرا میں اونٹ کی نکیل تھامے اسی طرح زخمی تلوؤں اور رستے ہوئے چھالوں کے ساتھ سفر جاری رکھیں گی۔

بقیہ: جب تک چاند یار ہاتھ اٹھائے مصروف دعا رہے؟...

سے ان کے قلم کی جنبش میری تقدیر کا فیصلہ کرنے والی تھی اور پھر دو سال کے طویل وقفے کے بیس سال گزشتہ سے ان کے قدموں کی خاک کو اپنے لیے سرمۂ حیات بنائے ہوئے ہوں۔ میں نے کلاس روم میں ان سے درس نہیں لیا لیکن مہابھارت کی عظیم داستان کے کردار ارجن کی طرح نہیں بلکہ ایکلویہ کی طرح میں نے انہیں اپنا استاد مان لیا ہے۔ الحمدللہ کا شکر ہے کہ جب بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں بقدرِ ظرف اکتسابِ فیض کرتا ہوں۔ میرے تحقیقی مقالے کے مکتوبات سے متعلق باب پر ان کی اصلاحیں میرے لیے مشعلِ راہ بھی ہیں اور میری شاگردی کا دستاویزی ثبوت بھی۔ وہ مجھ سے عمر میں زیادہ بڑی نہیں ہیں۔ سات آٹھ سال سے زیادہ کا فرق نہیں مگر میرے دل میں ان کا اسی طرح احترام ہے جس طرح ایک چھوٹے سے بچے کے دل میں اپنی ماں کا احترام ہوتا ہے۔ صرف میرے ہی کیوں۔؟ یہ جذبہ ان کے تمام شاگردوں کے دل میں ہے۔ ان کی پیشانی سے پھوٹتا ہوا شفقت اور ممتا کی پاکیزگی کا نور ہر شخص کی گردن جھکا دیتا ہے۔
میری دعا ہے جب تک گنگا جمنا بہتی رہے، جب تک چاند یار آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے مصروف دعا ہے۔ تب تک اکثر زینت ساجدہ کی شفقتوں کا نور اسی طرح برستا رہے آمین۔ ■■

وقار خلیل

(انٹرویو)

ڈاکٹر زینت ساجدہ سے ادبی گفتگو

حیدرآباد صدیوں سے باکمالوں، انشا پردازوں، عالموں، صوفیوں اور ایک ستھرے نیز متحدہ کلچر کا شہزادہ رہا ہے۔ قطب شاہی اور آصفجاہی ادوار ہوں یا جمہوری زمانہ ہر عہد اپنی ترسیل اور اظہار کے لئے عصری حسیت کا مظہر رہا ہے۔
عثمانیہ یونیورسٹی کے جن روشن خیال، بالغ نظر اور ذہین و فطین افراد و خواتین نے دکن کے نام کو چار چاند لگائے اُن میں ڈاکٹر زینت ساجدہ بھی ایک ہیں۔

۵۹ سال اُدھر کی بات ہے ۲۸ مئی ۱۹۲۶ء کو ایک قبول صورت، نیک سیرت لڑکی چھوٹی موٹی سی اپنے نانا مولوی سید احمد قادری المعروف بہ گنگی (ان کے گھر رائچور (کرناٹک) اندرون قلعہ میں پیدا ہوئی خونی رشتوں کی طہارت اور تقدیس، حق گوئی و حق پرستی زینت ساجدہ کو وراثتاً ودیعت ہوئی۔ اُن کے والد مولوی سید مصطفیٰ قادری سبزپوش انعامدار خاندان لوردیا سے ددھیالی اور قاضی محمود بحریؒ (من لگن مثنوی والے) سے ننھیالی رشتہ رکھتے تھے جو بیجاپور کے شرفاء اور سادات گھرانے کے محترم بزرگ تھے ان کے دادا جناب سید رسول قادری ناظر و پھر مددگار ناظم تعلیمات حکومت حیدرآباد تھے۔ موصوف بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے ڈکشنری والے کام میں شریک و معاون رہے ہیں، زینت ساجدہ کے ددھیالی افراد خاندان کی آج بھی گلبرگہ میں سکونت ہے، ان کے اجداد احمد شاہ ولی بہمنی کے زمانے میں حموی سادات کے نام سے شہرت رکھتے تھے پند و موعظت، رشد و ہدایت نیز پیری و مُریدی اِس گھرانے کا شعار رہا۔ عادل شاہوں نے انعام و اکرام اور زمینات سے نوازا۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے زینت ساجدہ ننھیالی اور ددھیالی ہر دو رشتوں سے سادات ہیں، گلبرگہ کے مشہور زمانہ ہفت گنبد کے اطراف و جوانب میں ان کے ددھیالی اعزا آج بھی سکونت پذیر ہیں۔

اس پس منظر میں جب ہم نے ڈاکٹر زینت ساجدہ سے شخصیت اور فن کے باب میں ان کے شوہر ڈاکٹر حسینی شاہد کی موجودگی میں اُن کے گھر کو ہسار واقع پنجہ گٹہ روڈ پر بات چیت کی تو عقدہ کھلا کہ "ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں ہے"۔

خلوص، انکسار، سادگی اور وضعداری ڈاکٹر شاہد اور ڈاکٹر ساجدہ کی فطرت کا روشن عکس ہے۔ ہم نے ابتدائی تعلیم و تربیت کے بارے میں استفسار کیا تو بتایا گیا کہ ددھیالی اور ننھیالی ماحول اور معاشرہ میں سب سے پہلے قرآن، دینیات اور اخلاقیات سے ذہن و دل کو کشادگی اور روشنی ملی۔ مدرسہ تعلیم المعلمات کاچی گوڑہ میں ابتدائی درجوں سے ثانوی درجوں تک تعلیم پائی۔ تحریر و تقریر میں یکساں مہارت کے باعث چوتھی جماعت سے ہی انعامی مقابلوں میں حصہ لیا اور ہر بار انعام ہی پایا۔ جماعت نہم میں زیر تعلیم تھیں کہ نشرگاہ حیدرآباد (ریڈیو) سے کہانیاں اور معلوماتی مضامین نشر کرنے لگیں۔ چہارم جماعت کی اس طالبہ نے پہلے پہل ایک ڈرامہ "باغبان" لکھ کر اساتذہ کو چونکا دیا۔ گھر کے بزرگوں نے حوصلہ افزائی کی۔ دادا کے بڑے بھائی مولوی سید عبد القادر نے ایک روپیہ سکہ عثمانیہ انعام دے کر ہمت بڑھائی۔ دادا سے علمی ذوق کو جلا ہوئی۔ ثانوی درجوں کی استانیوں مسز جبار، مسز اکرم، محترمہ تسنیم ربانی (بیگم صاحبہ جناب مسعود یزدانی) محترمہ لطیف النساء بیگم (بچوں کی مشہور شاعرہ) اور محترمہ قطب النساء ہاشمی (جنھوں نے بعد میں اردو سفر ناموں پر ڈاکٹریٹ کی) خدیجہ بیگم اور محترمہ طاہرہ بیگم نے اردو میڈیم کی تمام طالبات میں زینت ساجدہ کی ہر طرح تربیت کی۔ لکھنے کے شوق کو مطالعہ کے بغیر فروغ ممکن نہیں اس کلیہ کے تحت زینت ساجدہ نے بچپن سے اخبارات و رسائل اور مفید اصلاحی، علمی، ادبی و افسانوی کتابوں کے مطالعہ کو پیش نظر رکھا۔ ڈراموں میں حصہ لینے پر انھیں جب انعام میں "دارالاشاعت پنجاب لاہور" کی کتابوں کا سیٹ ملا تو پھر اُن کے جوہر کھلے، گھر پر "مدینہ" بجنور، بچوں کا رسالہ "غنچہ" اور "پھول" لاہور کے علاوہ ادبی رسالے "ہمایوں لاہور" اور مشہور دینی ماہنامہ "نظام المشائخ دہلی" پابندی سے آیا کرتے تھے، اس طرح مطالعہ اور لکھنے سے ان کی دلچسپی ارتقائی منزلوں سے گزرنے لگی۔ علمی دلچسپیوں کے ساتھ ساتھ کھیلوں میں فٹ بال سے شوق رہا اور اس ٹیم کی ممبر رہیں۔

ڈاکٹر زینت ساجدہ نے بتایا کہ فوقانی تعلیم کے حصول کے زمانے میں رواج کے مطابق طالبات ٹرام میں جایا کرتی تھیں جس پر چلمن پڑی ہوتی تھی۔ جامعاتی تعلیم کی تفصیلات کو اس گفتگو نے یوں سمیٹا کہ بلبل ہند سروجنی نائیڈو کے گھر گولڈن تھریشولڈ میں جہاں ویمنس کالج قائم تھا، سروجنی دیوی کی صاحبزادی مس میلامنی نائیڈو، مسز ڈگلس پیلین، مسز آغا، سلامت النساء بیگم، محترمہ جہاں بانو نقوی اور محترمہ جعفری بیگم ایسی اساتذہ نے طالبات کے فکر و نظر کو ان کی صلاحیتوں کے مطابق روشن کیا۔ زینت ساجدہ نے بتایا کہ وہ فلسفہ و منطق کو بطور مضمون اختیاری لینے کی آرزو مند تھیں مگر انٹر آرٹس میرٹ لانے اور علمی و ادبی شوق کی بنا پر ادبیات منتخب کئے اور اسی میں ایم اے کو ترجیح دی اور ٹاپ کیا۔ آرٹس کالج کے اساتذہ کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر سید سجاد، ڈاکٹر زور، پروفیسر ابوظفر عبد الواحد اور پروفیسر سید محمد کے علاوہ فارسی کے پروفیسر عبد الحمید خان اور پروفیسر کلیم اللہ حسینی ہندی کے پنڈت ونشی دھر ودیا النکار کے تدریسی کردار کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے گفتگو کو یوں آگے بڑھایا کہ دوران تعلیم ایم اے انھوں نے پروفیسر سجاد کی نگرانی میں اردو غزل پر ۱۹۴۰ء میں مقالہ تحریر کیا تھا اور جامعہ میں وہ اپنی فعال علمی صلاحیتوں کی بنا پر ممتاز رہیں، دوران تعلیم بزم اتحاد طلباء کلیہ اناث جامعہ عثمانیہ کی معتمد منتخب ہوئیں اور کلیہ اناث کی روایتی اور مشہور زمانہ کلچرل سرگرمیوں کے فروغ میں نمایاں حصہ لیا۔ یونیورسٹی کے ماحول کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا کہ طالبات کو تدریس کا انتظام پردہ میں ہوتا تھا اور ہفتہ میں ایک دن لڑکیاں ہاتھ کے رکشا میں [illegible]

یونیورسٹی لائبریری سے استفادہ کرتی تھیں۔ یم اے کامیاب کرنے کے بعد ویمنس کالج میں اپنی ملازمت کا ذکر کرتے ہوئے محترمہ زینت ساجدہ نے بتایا کہ اس زمانے کے قاعدے کے مطابق اردو اور تاریخ کے اساتذہ کو دینیات اور اخلاقیات بھی پڑھانا پڑتا تھا اس طرح انہوں نے ویمنس کالج میں مختصر عرصہ تک آرٹس کے ساتھ دینیات اور اخلاقیات بھی پڑھائی۔ مس لیبل ویمنس کالج کی پرنسپل تھیں ان دنوں کالی داس کا ڈرامہ شکنتلا اسٹیج کیا گیا اور "یوم غالب" بھی منایا گیا ان کلچرل سرگرمیوں میں زینت ساجدہ نے نمایاں کردار ادا کیا اور حیدرآباد کے علمی و ادبی حلقوں سے داد تحسین حاصل کی۔ اس کے علاوہ کئی ڈرامے اور مرقعے پیش کئے۔

اپنی تخلیقی اور ادبی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے محترمہ زینت ساجدہ نے بتایا کہ جب وہ ایم اے کی طالبہ تھیں کہانیوں کا مجموعہ "جل ترنگ" کے نام سے ۱۹۴۷ء میں منظر عام پر آیا اور ادبی حلقوں میں مشہور ہوگیا اسی دوران مشہور پبلیشر جناب اقبال سلیم گاہندری نے ان سے دو کتابیں لکھوا کر شائع کیں جن کے نام "محب وطن خواتین اور حکمران عورتیں" ہیں ان کتابوں پر ایک سو روپے رائلٹی کی صورت میں ملے تھے۔ اپنی دیگر تصانیف، تالیفات کا ذکر کرتے ہوئے محترمہ زینت ساجدہ نے بتایا کہ ریاستی ساہتیہ اکیڈمی نے ایک تذکرہ "حیدرآباد کے ادیب" ۲ جلدوں میں مرتب کرا کے شائع کیا۔ اس تذکرہ میں عہد عثمانی کے حیدرآبادی نثر نگاروں کا حال احوال اور ان کی منتخب ایک ایک تخلیقات شامل ہے مصنفوں پر سوانحی نوٹ محترمہ زینت ساجدہ نے اپنے مخصوص انداز نگارش میں لکھ کر اس تذکرۂ نثر کو باوقار بنا دیا ہے ریاستی انجمن ترقی اردو نے "تلگو ادب کی تاریخ" پر اہم کتاب راما نج راؤ کی رفاقت میں ان سے لکھوا کر شائع کی ہے اس کے علاوہ دکھنی کے کلاسیکی شاعر اور عادل شاہی حکمراں علی عادل شاہ شاہی کا "کلیات شاہی" بھی محترمہ زینت ساجدہ کی دکھنیات شناسی اور تحقیق و ژرف بینی کا شاہد ہے۔ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نے ایک تلگو ناول کا اردو ترجمہ "تاش کے محل" کے نام سے شائع کیا ہے۔ یہ ترجمہ تلگو، اردو پر نظر رکھنے والوں کے نزدیک محترمہ زینت ساجدہ کی فعال صلاحیتوں کو روشن کرتا ہے۔ آپ نے ۱۹۷۱ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے دکھنی شاعری کے اولین دور کے مخطوطہ اشرف کی "مثنوی نوسرہار" پر ڈاکٹر حفیظ قتیل اور پروفیسر مسعود حسین خاں سابق صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کی نگرانی میں اور پروفیسر حبیب الرحمٰن بانی ریاستی انجمن ترقی اردو کے اصرار پر پی ایچ ڈی کے لئے مثالی تحقیق کارنامہ انجام دیا ہے یہ مقالہ مستقبل قریب میں اردو اور ہندی میں اشاعت پذیر ہوگا جس سے دکنیات کے اُفق پر تخلیقی اور تحقیقی روشنی کے عکس اور رنگ جلوہ فگن ہوں گے، ایسا ہمارا یقین ہے۔

محترمہ زینت ساجدہ نے عثمانیہ یونیورسٹی کے ارباب اُردو کی ناپسندیدہ پالیسی کے باوجود تاخیر سے ہی سہی دکھنیات پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر کے ڈاکٹر زور اور دیگر بزرگوں نے ان سے جو توقعات وابستہ کی تھیں آخر کار انھیں پورا کیا۔

ایک سوال کے جواب میں ڈاکٹر ساجدہ نے ہمیں بتایا کہ "کہانی سننا اور کہانی کہنا انسانی فطرت میں داخل ہے اس لئے فکشن سے اُن کی وابستگی نیچرل امر ہے" پریم چند کو وہ ترقی پسند افسانوی ادب کا نقطۂ آغاز قرار دیتی ہیں۔ ابتداً کہانیاں اور انشائیے انہوں نے لکھے اور ایک ہی نشست میں قلم برداشتہ تخلیقی عمل کی ان کی عادت ہے۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ کی تخلیقات افکار بھوپال، کراچی، نظام بمبئی، سب رس حیدرآباد ادبی دنیا لاہور اور حیدرآباد کے چند قدیم رسائل ہفت روزہ نقش و نگار ماہنامہ ایوان اور رباب دیکلی میں مدیران

جرائد کی ناظر تو فرمائش پر شائع ہوتی رہیں۔ روزنامہ سیاست میں بھی ڈاکٹر ساجدہ کی نکھری ستھری تحریریں انشائیوں کی صورت میں چھپتی رہی ہیں۔ ضرورت ہے کہ ایک انتخاب ایسی تحریروں کا منظرِ عام پر آئے۔ ہمارے ایک استفسار کا جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر زینت نے بتایا کہ میرا اپنے معاصر ادیبوں سے یہ کہنا ہے کہ وہ ادب کو روزگار کا وسیلہ نہ سمجھیں اور اپنی بسر اوقات کے لئے کسی اور شعبۂ ملازمت سے منسلک رہتے ہوئے شوق کے طور پر لکھنے لکھانے کی طرف توجہ کریں، ایسا اس لئے ناگزیر قرار پاتا ہے کہ اردو کا ادیب اُن کی دانست میں صرف قلم کے ذریعہ قطعی زندہ نہیں رہ سکتا یا اس پر بھی جو لوگ ادب کو بطور پیشہ استعمال کرتے ہیں وہ سمجھوتوں اور مصلحتوں کا شکار ہو جاتے ہیں اور بڑا اور عصری ادب تخلیق کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ ڈاکٹر ساجدہ نے اس باب کی وضاحت کرتے ہوئے ماضی کے ادب اور ادیب کی مالیہ بدحالی کی چند ایک مثالیں بھی گنائیں۔ جن سے سبھی باشعور تخلیق کار بخوبی واقف ہیں۔

ترقی پسند تحریک پر بات چیت کا خلاصہ یہ ہے کہ ڈاکٹر زینت ساجدہ کی دانست میں زندگی کے مسائل پر ترقی پسند قلم کاروں نے ماضی سے کہیں بڑھ چڑھ کر لکھا ہے۔ پریم چند نے اردو فکشن کو ارضی کہانی کا تصور دیا ہے اور اسی تصور کی کامیاب ترسیل ترقی پسندوں کی رہینِ منت ہے۔ ترقی پسندوں کے بعد آج جو کہانیاں لکھی جا رہی ہیں وہ بے سمت اور بے چہرہ کہانیاں ہیں۔ ڈاکٹر ساجدہ نے اس امر پر زور دیا کہ جب ایک دور ختم ہوتا ہے تو نیا دور شروع ہوتا ہے اچھا کہانی نویس یادداشت کے طریق پر کہانی کے فن کو روشن کرتا ہے، عہدِ حاضر میں اس کی مثال قرۃ العین حیدر کی کہانیاں ہیں جو NOSTALGIC کہانی کی تعریف میں آتی ہے۔ ترقی پسند دور کی شاعری بھی محترمہ کی نظر میں زندگی کے مسائل کا روشن اظہار رہی ہے۔

حیدرآباد کے مختلف علمی و ادبی اداروں سے ڈاکٹر زینت ساجدہ کا ربط رہا ہے وہ ریاستی انجمن ترقی اردو کی تنظیم جدید ۱۹۵۰ء سے اب تک انجمن کی فعال رکن کی حیثیت سے فائز رہی ہیں اس کے علاوہ ریاستی ساہتیہ اکیڈیمی، ریاستی اُردو اکیڈیمی، بورڈ آف اسٹڈیز عثمانیہ یونیورسٹی کی رکن کے علاوہ مخدوم ادبی ایوارڈ کمیٹی کی چیرمن بھی ہیں۔ چھ سال تک ریڈیو کی صلاح کار کمیٹی کی رکن رہیں۔ ان دنوں نظام کالج عثمانیہ یونیورسٹی میں ڈپارٹمنٹ آف لینگویجز کی انچارج اور صدر شعبۂ اردو کے عہدہ پر فائز ہیں۔ اپنے شاگردوں کو ادب شعر، تحقیق اور تخلیق کے تیر بہدف نسخوں سے واقف کرا کر انھیں طاق بنانے میں ان کا بڑا حصہ رہا ہے اور اس ہنر میں ان کا ثانی شاید نہ ملے۔ افسانہ، انشائیہ، لوک گیت اور دکنیات اور ترقی پسند ادبی رجحانات پر ڈاکٹر ساجدہ کی عمیق نظر رہی ہے حیدرآباد کے افسانوی ادب پر اظہار خیال کرتے ہوئے محتاط انداز میں یوں تبصرہ کیا کہ "حیدرآباد میں کوئی قد آور ناول ابھی نہیں لکھا گیا۔ ہاں اقبال متین حیدرآباد کے نامور اور با صلاحیت کہانی نویس ہیں جنھیں ہم ہند و پاک کے کسی بڑے افسانہ نویس کے مقابل رکھ سکتے ہیں۔ انشائیہ اور طنز و مزاح کے باب میں حیدرآباد والوں نے اطمینان بخش کام انجام دیا ہے۔ مجتبیٰ حسین مزاح لکھنے والوں میں اہم نام ہے۔

دکھنی ادب اور دکھنیات پر کھل کر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر زینت ساجدہ نے جب اپنے خیالات ظاہر کئے تو ہم نے دیکھا ڈاکٹر حسینی شاہد بھی سنبھل کر بیٹھ گئے اور مسکراہٹ اُن کے خشک لبوں پر رقص کرنے لگی۔ ڈاکٹر ساجدہ نے کہا "دکھنیات اردو کا قدیم

سرمایہ ہے جس سے ہم اپنی وراثت جوڑ سکتے ہیں۔ اردو میں پہلا ادبی اور لسانی تجربہ تحریری صورت میں دکھنیات ہی میں ملتا ہے جسے کافی عرصے بعد شمال والوں نے اپنایا ادب اور زبان کے ہر طالب علم کیلئے دکھنیات شناسی کا علم ایک سطح پر ضروری اور ناگزیر قرار پایا ہے تاکہ لسانی اور ادبی تسلسل سے واقفیت ہوسکے اسی اہمیت کے پیش نظر ملک کی بیشتر جامعات میں دکھنیات کو نصاب کا حصہ بنایا گیا ہے دکھنی علاقوں کے علاوہ جہاں بھی دکھنیات کی تدریس اور تفہیم کا انتظام ہے وہ قابل تشفی نہیں ہے غیر دکھنی علاقوں میں دکھنیات کی تدریس کا اہتمام سہل نہیں مشکل فن ہے"۔ حیدرآباد کے محققوں کے بارے میں ڈاکٹر ساجدہ نے بتایا کہ حکیم شمس اللہ قادری، بابائے اردو مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر زورؔ نے دکھنی ادبیات کی بازیافت، تحفظ اور تحقیق میں مثالی حق ادا کیا ہے۔ نصیرالدین ہاشمی نے دکھنی ادب کی خدمت کے علاوہ کیٹلاگنگ اور فہرست سازی کی اہمیت کو محسوس کرکے اپنا حصہ ادا کیا ہے۔ نواب سالار جنگ نے سلسلۂ یوسفیہ کے تحت دکھنی شعر و ادب کے اہم اور کلیدی سرمایہ کو شائع کرکے بڑا کام کیا ہے ان کے اس کارنامے کو ڈاکٹر زورؔ، پروفیسر سروری، پروفیسر سید محمد اور سعادت علی رضوی نے ادبی صورت گری عطا کی۔ عاصرین دکنیات کے اسکالروں میں ڈاکٹر حفیظ قتیل، محمد اکبرالدین صدیقی، سخاوت مرزا ڈاکٹر حسینی شاہد اور سیدہ جعفر قابل ذکر ہیں"۔ ایک اور سوال کے جواب میں ڈاکٹر ساجدہ نے بتایا کہ " قدیم تحقیقی کارناموں کو کمتر کرنے کا رجحان معیوب ٹھہرتا ہے۔ چونکہ تحقیق دو سطحوں پہ ہوتی ہے۔ پہلے کارناموں کو تذکرہ، تعارف اور فہرست سازی کے ذریعہ محفوظ کرلیا جاتا ہے پھر تنقیدی شعور اور تحقیق دروں بینی سے بازیافت یا چھان پھٹک کا عمل کیا جاتا ہے۔

ادبی امور پہ ہماری اس گفتگو کے درمیان زینت آپا نے موسم کی رعایت کو پیش نظر رکھتے ہوئے شربت اور برف میں لگے ہوئے تربوز اور بے دانہ انگوروں سے دل و دماغ کو طراوت پہنچائی۔ آپا کے بچوں آمنہ شاہد، سجاد شاہد اور نفیس شاہد سے بھی تعارف ہوا۔ آمنہ سرو قد، ذہین اور ہنس مکھ صاحبزادی ہیں عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم اے انگریزی ادبیات میں کرچکی ہیں اردو شعر و ادب سے نابلد نہیں ہیں۔ سجاد مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے سپوت ہیں سیول انجینیر بی ای کیا ہے۔ ڈاکٹر شاہد اور ڈاکٹر ساجدہ نے اپنے استاد پروفیسر سید سجاد کی یاد اور محترم کی پیدائش کی بنا پر اس نام سے نوازا ہے۔ خوبصورت آئیڈیل اور اسمارٹ نوجوان ہیں چھوٹے صاحبزادے نظام کالج میں بی کام سال دوم میں زیر تعلیم ہیں، خوش گفتار، کھلنڈرے اور موروثی ذہانت کے حامل ہیں اردو کلچر کی قدیم روایات کے یہ تینوں قدر شناس اور پاسدار لگتے ہیں بقول "سچ ہے ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات"

حیدرآباد کے ادبی ماحول پر اُچٹتی سی نظر ڈالتے ہوئے ڈاکٹر زینت ساجدہ نے بتایا کہ میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے بھی حیدرآباد علم و ادب کا مرکز رہا ہے۔ قیام جامعہ عثمانیہ کے بعد حیدرآباد کے ادبی شوق ذوق نے شخصی دیوان خانوں کو خدا حافظ کہا اس طرح شعر و ادب عوام کا حصہ بن گیا۔ محمد قلی قطب شاہ کے زمانے سے محبوب علی پاشاہ و غفران مکان مہاراجہ چندولال اور مہاراجہ کرشن پرشاد کے زمانے میں شعر و ادب کی سرپرستی اور قدردانی ارتقائی مدارج سے ہمکنار ہوتی اور فروغ پاتی رہی۔ حیدرآباد والوں کے طرز حیات کا ایک نام ادب اور کلچر بھی ہے۔ کئی کل ہند نوعیت کی کانفرنسیں، سمینار یہاں منعقد ہوا کئے۔ ادارۂ ادبیات اردو نے ۱۹۳۸ء میں کل ہند اردو کانگریس کا وسیع پیمانہ پر حیدرآباد میں انعقاد کیا۔ مختلف شاندار یوم منا کر اس کے بعد ہم نے ترقی پسندوں

اور انجمن ترقی اردو کی طرف سے تین چار شاندار کل ہند کانفرنسیں منعقد کیں۔ ولی، حالی، امجد، اقبال، حسرت کے فکر و فن کو زبردست خراج ادا کیا گیا، یہ سب کچھ ہوتا رہا آج کل کی ادبی سرگرمیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگلوں کی سی وسیع القلبی اور وسیع النظری اب مفقود سی ہوتی جا رہی ہے، لوگ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ گئے ہیں، شخصی اظہار زیادہ اور علمیت کم ہو گئی ہے۔ ویسے پرانے شہر کی شعری سرگرمیاں ایک یا دو استادوں کے بل بوتے پر جاری و ساری ضرور ہیں۔ میں نے حیدرآباد میں شام غزل کا ایک یادگار پروگرام ترتیب دیا تھا اور اس امر کی کوشش کی تھی کہ ہماری تہذیب رفتہ کے دلکش اور مثبت عناصر کو عوام سے روشناس کرا سکوں، اب ایسے پروگرام کہاں ہوتے ہیں، لوگ خوشامد پسند اور کاروباری ذہن کے ہو گئے ہیں۔ انہوں نے کئی مشاعروں شام غزل اور ادبی پروگراموں میں اچھی کمپیرنگ کی مثال قائم کی تھی۔ اس کا کبھی کوئی معاوضہ نہیں لیا۔ آج بھی لوگ ان کے کمپیرنگ کو یاد کرتے ہیں۔

ملک بھر اردو اکیڈیمیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر زینت نے کہا کہ ان اکیڈیمیوں سے زبان، ادب اور ثقافت کو تھوڑا بہت فائدہ ضرور ہوا۔ ان نیم سرکاری اداروں کو اپنی تنگ نظریوں اور سیاسی مصلحتوں سے بالاتر ہو کر کام کرنا چاہیئے۔ بزرگ اور قدیم شعراء کی اعانت اور ان کی شاعری کی اشاعت میں اکیڈیمیوں کا مالی تعاون، کتب خانوں کی امداد اچھی شروعات ضرور ہیں، اسی طرح اکیڈیمیاں چند اصحاب کے لئے وسیلۂ روزگار تو ہیں مگر انھیں کلاسیکی ادب کو اپنے طور پر انتخابی بورڈ کی منظوری کے بعد منصوبہ بند پروگرام کے تحت چھاپنا چاہیئے۔

گھریلو زندگی پر ہمارے ایک سوال کے جواب میں ڈاکٹر زینت صاحبہ نے بتایا کہ بہ حیثیت بیوی میرا کیسا کردار رہا ہے اس کا جواب شاہد صاحب سے پوچھئے اور بہ حیثیت ماں میں کیا ہوں' یہ میرے بچوں سے دریافت کیجئے۔ مجموعی طور پر میں اپنے گھر کے ماحول سے پوری طرح آسودہ اور مطمئن ہوں اور بڑا سکون محسوس کرتی ہوں۔ جہاں تک میرے لکھنے پڑھنے کا ماحول ہے' شاہد صاحب نے میرے ادبی ذوق و شوق کی نشو و نما میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ دکھنیات تو میرے گھر کی زبان ہے۔ تو سر راہ پر پی ایچ ڈی مقالہ کی تیاری میں مجھے ڈاکٹر حسینی شاہد کی ہم آہنگی اور یگانگت سے استفادہ کا موقع ملا مگر تحقیق کے مسائل میں اکثر ہم متفق الخیال نہ ہو سکتے تحقیق کی زبان میں میرے اسلوب تحریر سے شاہد صاحب کو اختلاف رہا انہوں نے ہمیشہ علمی زبان پر زور دیا ہے۔

چند چھوٹے چھوٹے سوالات کا اجتماعی جواب دیتے ہوئے زینت آپا نے بتایا کہ میں نے دکھنی گیتوں پر بہت سا مواد اکھٹا کیا ہے، آرزو ہے کہ یہ اہم اور ادھورا کام پایۂ تکمیل کو پہنچے۔ دکھنی تہذیب کے مسائل بھی میری فکر و نظر کا محور رہے ہیں اب ارادہ ہے کہ وظیفۂ حسن خدمت کے بعد انھیں انجام دوں، تقریر بازی نے مجھے نقصان پہنچایا، اظہار کا ذریعہ جب بل جاتا ہے تو دوسرا ذریعہ سرد پڑ جاتا ہے اب تحریر سازی کی طرف خود کو راغب کر لوں ایسا میرا ارادہ ہے۔ مطالعہ میری خوبی یا کمزوری آپ جو چاہیں کہہ لیجئے رہی ہے' بہت پڑھا اور پڑھتے کا ارادہ ہے۔ بقول شاعر" عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں" فارسی، ہندی اور انگریزی سے آشنا ہوں جنوب کی لسانی روایتوں زبانوں اور ان کے تراجم سے دلچسپی رہی ہے۔

حالیہ دورۂ پاکستان کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ "میرا یہ سفر نجی تھا، والدہ صاحبہ کی مزاج پرسی اللہ قدم بوسی اس سفر کا اہم باب تھا۔

وہاں کے کئی ڈائجسٹ رسائل کی مقبولیت سے اندازہ ہوا کہ لوگ مختلف النوع تحریریں پڑھنے کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں ادبی رسائل کا حال اس قدر حوصلہ افزا نہیں ہے حالانکہ ڈائجسٹ قسم کے رسائل قاری کی علمی یا فطری سطح پر بھرپور رہنمائی سے قاصر ہوتے ہیں اس کے علاوہ آج کے ادیب کے غم ذات نے اسے دوسروں سے بے تعلق کر دیا ہے۔ فکشن کا تعلق عوام کے مسائل اور دلچسپی دونوں سے ہوتا ہے وہ اگر چیستان بن جائے تو لوگ ڈائجسٹ ہی پڑھیں گے۔ ڈائجسٹ اردو کے فروغ میں کارآمد ہیں۔ میرا ادبی رسائل نکالنے والوں کو مشورہ ہے کہ وہ اسے فل ٹائم ورک سمجھیں، نکاسی، تشہیر اور ترتیب کے لئے علیحدہ علیحدہ شعبے ہوں اور ہر ماہ کا رسالہ وقتِ مقررہ پر پڑھنے والے تک پہنچے۔

ہندوستان میں اردو کے مستقبل کے بارے میں اپنے تجربے اور ذہن کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر زینت ساجدہ نے بڑی اچھی اچھی باتیں بتائیں۔ آپ بھی پڑھ لیجئے وہ کہتی ہیں۔ "اردو کا مستقبل خود مستقبل طے کرے گا۔ حکومتوں کے تعاون اور سرپرستی کے بغیر کوئی زبان ترقی نہیں کرسکتی کسی زبان سے اگر روزگار چھین لیا جائے اور پھر اُس کی سرپرستی کی جائے؟ اس رویّہ کا کیا جواب ہوگا۔ یہ آج ہو رہا ہے۔ حکومتی تعاون کی پہلی شرط یہ ہونی چاہیئے کہ اُس زبان کو جسے آپ تسلیم کرتے ہیں روزگار کی پہلی ضمانت دی جائے۔ ہاں اردو زبان کے بولنے اور پڑھنے والوں میں اپنی زبان اور اس کے ادب کی ترقی اور فروغ کا دل سے جذبہ ہونا بھی ضروری ہے۔

اب حکومتوں کا رویّہ بڑی حد تک اُردو کے تعلق سے بدل رہا ہے جو اُمید افزا ہے، خود اُردو والوں میں اپنی زبان سے رفاقت کا جذبہ کم ہو رہا ہے۔ والدین کو چاہیئے کہ وہ بچوں کی ابتدائی تعلیم مادری زبان اردو میں دلائیں یا کسی نہ کسی سطح پر اردو زبان کو کم از کم انھیں گھر پہ ہی آشنا کریں۔ مجموعی طور پر تعلیمی معیار گھٹ رہا ہے جس کے سبب گونگی اور بہری نسل پیدا ہو رہی ہے اور یہ صورتِ حال پریشان کن ہے۔ اردو کو محفوظ رکھنے کے ساتھ ساتھ اردو والوں کے لئے علاقائی زبان اور انگریزی کی تحصیل بھی ضروری ہے۔ اس جانب اولین توجہ ہر اردو دوست کو دینی چاہیئے ورنہ ریڈیو اور فلم کے ذریعہ ہماری زبان بازاری زبان کی سطح پہ باقی رہے گی، علمی حیثیت سے کمزور ہو جائے گی۔

ڈاکٹر زینت ساجدہ نے ہماری خواہش پر "پونم" پڑھنے والوں کو یہ پیام دیا کہ "جہاں بالکل اندھیرا ہے ایسے رسالے روشنی کی لکیر کا کام انجام دیتے ہیں۔ لکھنے پڑھنے والوں کا فرض ہے کہ ادبی رسائل کی حوصلہ افزائی کریں، قدیم رسائل کی کامیابی اظہار کے وسائل کی کمی تھی اب جبکہ ریڈیو، ٹی وی اور فلم اتنے ادارے ہیں اور لوگ ان سے پوری طرح مطمئن ہو جاتے ہیں پھر کیا پڑی ہے کہ ادبی رسالہ خریدیں۔ اس لیے ادبی رسائل کا کاروبار کرنے والوں کو عصری طور پر اپٹوڈیٹ بننا چاہیئے تاکہ باذوق قاری بک سیلر کے پاس جب ان کا پرچہ دیکھے تو فوراً خریدنے کو بڑھے۔

"لذیذ بود حکایت دراز گفتم" کے مصداق ڈاکٹر زینت ساجدہ سے ادبی گفتگو کی یہ روداد معروضی ہوتے ہوئے بھی کچھ ویسی ہے جیسی کہ ہونی چاہیئے۔ وجہی نے سچ کہا تھا ؎

دکھن سا نہیں ٹھار سنسار میں　　پنج فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں

■■

نیک تمناؤں کے ساتھ
شاہین پرنٹرز
۱۴۔ آزاد مارکٹ عیسیٰ میاں بازار
حیدرآباد ۲۷

زورؔ صاحب جامع الصفات شخص تھے۔ مقرر۔ ادیب۔ نقاد۔ ماہر لسانیات۔ ثقافت و تہذیب کے مورخ اور دکنیات کے محقق۔ ادارۂ ادبیات اردو اور ایوانِ اردو کے اندر ان کی شخصیت کے یہ سبھی پہلو محفوظ اور زندہ ہیں۔ وہ بے حد باعمل آدمی تھے۔ ایک بار جو بات دماغ میں آگئی تو پھر صرف خیال نہ رہ گئی۔ بہت جلد عمل بن گئی یہی ان کی خصوصیت افتادِ طبع کا ان کے ہر جاننے والے نے اعتراف کیا ہے۔ ظاہر ہے جس شخص کا دائرہ عمل اس قدر وسیع ہو اور عمل میں وہ اس قدر سرگرم بھی ہو تو اسے سمجھنے کے لئے انھیں پیمانوں سے کام لینا ہوگا۔ جو کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے میں معاون ہوں۔ ان پر یہ اعتراض بھی کہ ان کے کارناموں میں حسنِ اختصار و بیان تاطول کہلانے کی خصوصیت نہیں لیکن کام کی وسعت کا اندازہ کرکے اس کی داد دینی ضرور ہے کہ اپنی منتخب کردہ راہوں میں انھوں نے کتنا کام انجام دیا ہے اور اپنے بعد آنے والوں کے لیے نہ صرف یہ کہ میدان ہموار کیا بلکہ بے شمار راہوں کی نشاندہی میں کامیاب بھی رہے۔ اسی لیے آج کا ادبی یا تہذیبی مورخ ان کے ذکر کے بغیر اپنے کسی جائزے کو مکمل نہیں قرار دے سکتا صوتیات میں آج ہم بہت آگے نکل گئے ہیں لیکن کیا زورؔ صاحب کی "روحِ تنقید" "ہندوستانی لسانیات" اور اردو کی صوتیات کی اولیت اور اہمیت کا اعتراف کئے بغیر ان موضوعات پر کچھ کہا جا سکتا ہے ؟ یقیناً نہیں۔

ڈاکٹر زینت ساجدہ

ڈاکٹر زورؔ تحقیق کے میدان میں

ان کی شخصیت کے ان تمام پہلوؤں میں اگر کوئی نمایاں پہلو ہے تو وہ ان کی تحقیق ہے۔ اپنے تحقیقی کارناموں کے لئے انھوں نے جس میدان کا انتخاب کیا تھا وہ اس کے لئے ہر طرح موزوں تھے۔ گولکنڈہ کی تہذیبی تاریخ اور دکنی مخطوطات پر مسلسل کام کرکے انھوں نے اردو کی چار سو سالہ ادبی اور لسانی روایات کی بکھری ہوئی کڑیاں فراہم کرکے ان کے تاریخی تسلسل کو سمجھنا آسان بنا دیا۔ اردو شہ پارے۔ حیاتِ محمد قلی۔ حیات میر محمد مومن، دکنی ادب کی تاریخ، کلیاتِ محمد قلی کی تدوین۔ داستانِ ادبِ حیدرآباد۔ حیدرآباد فرخندہ بنیاد اور دکنی مخطوطات کی توضیحاتی فہرستوں کی ترتیب ان تحقیقی کام کی نمایاں مثالیں ہیں۔ اس خالص تحقیقاتی کام سے بھی پہلے انھوں نے گولکنڈہ کے ہیرے اور سیرِ گولکنڈہ جیسی نیم تاریخی، نیم افسانوی کتابیں لکھ کر وہ مخصوص ذہنی فضا تیار کر دی تھی جو دکنی تہذیب و ادب سے دلچسپی پیدا کرنے کے لئے ضروری تھی۔

تحقیقی میدان میں ان کی قدر آور اور محقق گو شخصیت کو پہچاننے اور ان کے کام کی افادیت کا اعتراف کرنے کے لئے خود تحقیق کے بارے میں ایک دو باتیں ذہن میں رکھنی ضروری ہیں۔ تحقیق کے عام طور پر دو رجحان ہیں ایک عمیق اور دوسرے وسیع اور اس کی بھی مختلف سطحیں ہوتی ہیں۔ عمیق تحقیق کا رجحان رکھنے والے عام طور پر کسی اکائی یا محدود موضوع پر کام کرتے ہیں جیسے ان کا موضوع کوئی ایک شخصیت کا کارنامہ، رجحان، تحریک یا صنف ہوں گے۔ ممکنہ مواد کی دیدہ ریزی سے چھان بین ایک ایک نکتے کی صداقت و استناد سے بحث

مختلف پہلوؤں سے نفس موضوع کا جائزہ لے کر نتائج اخذ کرنا اس طرح کہ دستیاب مواد کی حد تک ان کی رائے حرف آخر بن جائے اور ناقابل تنسیخ سمجھی جائے۔ لیکن یہ تحقیق ایک محدود موضوع پر ہی میسر آسکتا ہے۔ جب کہ مواد کی فراہمی کے سلسلے میں اس سے پہلے موضوع کی نشاندہی کی جاچکی ہو۔ تحقیق وسیع یا عمیق سے پہلے کا درجہ ہوتا ہے۔ یہاں نایاب یا گمشدہ کی بازیافت ہی جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ ایک پورے دور کو احاطہ کرنے والے مواد کو جہاں سے ملے جس طرح ملے۔ جتنا ملے۔ سمیٹنا اور اکٹھا کرنا۔ ان تمام گوشوں کو ٹٹولنا جہاں سے مواد فراہم ہوسکے بعض وقت پیر دریا کھنگال ڈالنا اور موتی ملیں کہ سیپی۔ سب کا ڈھیر لگا دینا تاکہ بعد میں اس مواد سے حسب ضرورت کام لیا جاسکے۔ مواد کو جمع کرنا۔ محفوظ کرنا اور سلیقہ سے مرتب کر دینا ہی اس طریق تحقیق کے نمایاں وصف ہیں۔ اسی دستیاب مواد کی نشاندہی پر تحقیق عمیق کے خیابان رد و اخذ کر کے تقابلی مطالعہ کر کے اور مختلف کسوٹیوں پر جانچ کر فیصلہ صادر کرسکتے ہیں۔ اگر وسعت تحقیق کو منتخب کرنے والا بھی یہی کرنے لگے اور تفصیلات کی باریکیوں میں جانچ پڑتال میں وقت خارج کرے تو اس بات کا اندیشہ ہوتا ہے کہ مواد جمع کرنے اور محفوظ کر دینے کا اہم کام پس پشت پڑجاتا ہے۔

ان دونوں طریقہ ہائے کار کی اپنی اپنی جگہ اہمیت مسلم ہے اور دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں اس لیے یہ بڑی زیادتی ہوگی کہ ہم ایک طریق کار کے پیمانے سے دوسرے کو جانچنے اور حکم لگانے بیٹھ جائیں۔ زور صاحب کی تحقیق کا مسلک وسعت کا تھا۔ اگرچہ مولوی عبدالحق دکنی مخطوطات پر کام کی شروعات کرچکے تھے لیکن ان کا مزاج دکنیات کا نہ تھا۔ زور صاحب نے اس کام میں ہاتھ ڈالا تو کامیابی نے قدم چومے اور دیکھتے دیکھتے انھوں نے نایاب مخطوطات کا ڈھیر لگا دیا اور انھیں اردو دانوں سے اس طرح متعارف کروایا کہ اردو تاریخ زبان و ادب کی عمر میں دو ڈھائی صدیوں کا اضافہ ہوگیا۔ وہ اس میدان تحقیق کی بہت سی شرائط کی تکمیل کرنے والی شخصیت رکھتے تھے۔

وہ خود دکنی تھے ان کے لئے مخطوطوں کی زبان اتنی اجنبی اور گنجلک نہ تھی کہ پرانی لغات کی مدد سے اگر لفظ کچھ میں آ بھی جائے تو معنی یا مفہوم آسکیں۔ یہ ان کی اپنی زبان تھی۔ ان کے گھر کی زبان تھی۔ ان کے خاندان کی زبان تھی چنانچہ ان کے لئے یہ زندہ زبان تھی مردہ نہیں۔ اس لیے اس زبان کے مخطوطے پڑھنے میں انھیں زیادہ تکلف نہ ہوتا تھا۔ دکنی ہونے کے ناطے مغلوں کے مقابلے میں گولکنڈہ کے قطب شاہی یا بہمنی انھیں اپنے معلوم ہوتے تھے۔ اس لئے اس عہد پر کام کرنے کے لئے جس ہمدردانہ رویے کی ضرورت تھی وہ ان کے لئے فطری تھا۔ مستعد نہیں۔ پھر دربار کے علاوہ دکنی عہد عبارت ہے صوفیائے کرام کے نثری رسالوں اور شعری تخلیقات سے وہ مشائخ زادے تھے۔ تصوف کی اصطلاحات و رموز کو سمجھنا ان کے لیئے نسبتاً آسان تھا۔ متن ان کے لئے چیستاں نہیں قابل فہم تھا۔ وہ لسانیات کے تربیت یافتہ معلم بھی تھے۔ الفاظ کی اشکال اور ان کی عہد بہ عہد تبدیلیوں کو سمجھنا ان کے لئے مشکل نہ تھا۔ وہ علم صوتیات کے رموز آشنا تھے اس لئے دکنی صوتیات کی چھان بین کرنا ان کے لئے سہل تھا۔ وہ مخطوط پڑھنے ' کاغذ پہچاننے ' نستعلیق ' نسخ ' کوفی کے علاوہ خط ثلث کے پڑھنے میں ماہر تھے۔ عام طور پر دکنی کتبے خط کوفی اور دکنی مخطوطے خط ثلث ہی میں لکھے ملتے ہیں چونکہ وہ اس زبان کے بولنے والے تھے اس لیے نقاط، مراکز اور شوشوں کی گڑبڑ کے باوجود الفاظ کا تعین اور تلفظ وہ بڑی آسانی اور یقین کے ساتھ کر سکتے تھے۔ انگلینڈ اور فرانس میں انھوں نے جدید اور سائنٹفک تدوین متن کے طریقے سیکھے تھے اور فارسی اور عربی

زبانوں سے واقف ہونے کی وجہ سے مشرقی طریقۂ تحقیق ان کے لئے گھر کی بات تھی۔ انھیں دستیاب مواد کو سلیقے اور وضاحت سے پیش کرنے کا ہنر بھی آتا تھا اور مواد کے ذخائر تک ان کی پہنچ تھی۔

ان سب باتوں کے علاوہ ان کے دل میں اسبابت کا ولولہ اور جذبہ بھی موجود تھا کہ دکھنیوں کو روایتی انکساری اور آہستہ خوانی بلکہ کم گوئی کی وجہ سے جو گوشۂ گمنامی نصیب ہے اس سے خود نکلیں اور دوسروں کو نکالیں۔ اس لئے انھوں نے ٹوٹ کر کام کیا۔ دن رات ایک کر کے کام کیا اور اپنے ان تحقیقاتی کاموں کے ذریعہ دکھنی تہذیب و تمدن کے بہت سے نظروں سے اوجھل گوشے منور کر دیئے۔ ایوانِ اردو کے ذخیرے پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوتا ہے کہ بے شمار مخطوطوں کے ساتھ ساتھ خوشنویسی کے نمونے، سکے، تصاویر، ظروف، ہتھیار، شجرے، نسب نامے، نقشے اور عکس اس میں شامل ہیں۔ انھوں نے جس دور پر تحقیق کی ہے اس کی تہذیبی تاریخ بھی مرتب کر دی ہے۔ ان کی دسترس کہاں تک تھی وہ لوگوں سے کس طرح کام لینا جانتے تھے اس کا اندازہ اس ذخیرے کو دیکھ کر ہی ہو سکتا ہے جیسے نواب عنایت جنگ کی دبیر اور حسنِ ترتیب سے اور چمکا دیا ہے۔ اگر وہ ان سب چیزوں کو سمیٹ نہ لیتے تو شاید یہ چیزیں دستبردِ زمانہ کی نذر ہو جاتیں۔ انھوں نے ایک طرح دو ہری خدمت انجام دی ہے۔ ایک تو خود اس بیش بہا سرمایہ کو محفوظ کر دیا دوسرے دیگر ذخائر میں جو کچھ موجود ہے اس کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے اور حفاظت کرنے والی نظرِ عام کر دی۔ مواد کی فراہمی کے سلسلے میں انھوں نے دکن کا چپہ چپہ چھان ڈالا۔ فرامین، خاندانی بیاضیں، شجرے اور نسل نامے۔ قدیم مکاتیب، عاشور خانے اور درگاہیں۔ تاریخی کھنڈر اور تعمیری آثار، سرکاری اور خانگی دستاویز یہ ان کی فراہمی کے لئے وہ بہت گھومے پھرے ہیں۔ صرف خبر پر اکتفا نہیں کی۔ نظر کی تصدیق بھی چاہی۔

اُردو شہ پارے کی اشاعت نے دکھنی تحقیق میں ان کے داخلہ کو مستند کر دیا۔ اس ضخیم کتاب میں کئی دکھنی ادیبوں اور شاعروں کا انتخاب شامل ہے جن میں سے اکثر کا نام بھی اس سے پہلے نہیں سنا گیا تھا۔ اس انتخاب کے لئے انھیں ہندوستان اور یورپ کے کئی ذخائر اور مخطوطے کھنگالنے پڑے۔ جن لوگوں کی انھوں نے نشاندہی کی ہے۔ ان میں چند پر تفصیلی تحقیق اب ہو چکی ہے اور بہت سی نئی اور اہم باتیں منظرِ عام پر آئی ہیں۔ لیکن اب بھی کئی نام منتظر ہیں کہ زورؔ صاحب کی معلومات سے استفادہ کر کے ان پر عمیق تحقیق کی جائے۔

اسی طرح محمد قلی کے کلیات کی تدوین آسان نہ تھی۔ یہ کارنامہ اکیلا ایسا ہے کہ دکھنی تحقیق میں زورؔ صاحب کو ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ انھوں نے صرف کلیات کی تدوین ہی نہیں کی بلکہ ایک تفصیلی مقالہ حیاتِ محمد قلی پر لکھ دیا۔ جس میں نہ صرف اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر کی زندگی اور سیرت پر روشنی ڈالی ہے بلکہ اس دور کی تاریخ۔ تہذیب۔ رسم و رواج۔ زبان۔ طرزِ معاشرت عید تیوہار۔ میلے۔ تقریبیں۔ فنِ تعمیر۔ مذہبی رجحانات۔ سیاسی مسائل اور اہم شخصیتوں سے بھی سیر حاصل بحث کی ہے اس بحث کے لئے انھوں نے دونوں طریقے استعمال کئے ہیں۔ یعنی تاریخی اور بیرونی شہادتیں بھی اور داخلی شہادتیں بھی۔ اس لئے ان کا یہ کارنامہ اس عہد کی ایک اہم دستاویز بن جاتا ہے۔ کلام کی ایڈیٹنگ میں انھوں نے نہایت جانفشانی سے کام لیا ہے اور کہیں تحقیق دیانت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اگرچہ عصری طریق تدوینِ متن کی بنیاد پر ان کے مرتبہ متن پر اعتراض کیا جا سکتا ہے لیکن یہ رویہ درست نہ ہوگا۔ انھوں نے اپنے عہد کے اصولِ تدوین کو پیش نظر رکھا تھا اور آج وہ پرانے ہو چکے ہیں تو اس میں ان کا قصور نہیں اس لئے ہمیں انھیں معیاروں سے ان کا جائزہ لینا ہوگا ورنہ ایک زورؔ صاحب پر کیا موقوف ہے اس عہد کے تمام محققوں کی تحقیق پر پانی پھیر جاتا ہے۔ جن میں مولوی عبدالحق بھی شامل ہیں عصری معیار کے پیش نظر جو اعتراض کلیات محمد قلی پر کئے جا سکتے ہیں۔ ان سے قطب مشتری اور سب رس بھی

نہیں بچپنے بلکہ زیادہ زد میں آتے ہیں۔

حیات محمد قلی کے ساتھ ساتھ ہی انھیں اس دور کی اہم شخصیت میر محمد مومن کے بارے میں بہت سا مواد دستیاب ہوگیا۔ انھوں نے میر مومن کے ثمرات کی دکنی ادب و تہذیب پر نشاندہی کی خاطر اس مواد کو بھی علیحدہ کتابی صورت میں شائع کر دیا۔ انھوں نے ان دونوں کتابوں کے مواد کے لئے تاریخ کے ساتھ ساتھ روایات سے بھی کام لیا ہے اور ان سب روایات کو جو زبان زد عام رہا ہیں تھیں محفوظ کر دیتے تو ممکن تھا کہ انقلاب زمانہ انھیں سرے سے محو کر دیتا ہے۔

دکنی ادب کی تاریخ میں انھوں نے تسلسل کے ساتھ ان تمام اہم دکنی شاعروں اور ادیبوں کا عہد بہ عہد تذکرہ لکھا ہے جن کے کلام کی دکنی دور میں اہمیت رہی ہے اور ذیلی طور پر بہت سے ایسے نام بھی گنوائے ہیں جن کے کلام کی کھوج کی جا سکتی ہے ان میں سے بیشتر نام کل تک اجنبی تھے آج ان کے بارے میں بہت سی تفصیلات منظر عام پر آچکی ہیں اور چند ابھی تک دعوت نظر دے رہے ہیں کہ ان پر تفصیلی اور تحقیقی کام ہو۔ زور صاحب نے محض نام گنوا کر بھی اہل تحقیق کو ادھر متوجہ کر دیا ہے۔ یہ خود قابل قدر بات ہے

تحقیق عام طور پر خشک اور سنگلاخ وادیوں کا کام ہے زور صاحب نے اسے نظری اور دو ٹوک لہجہ عطا کیا ہے۔ موضوع کے مطابق صاف سلیس واضح اور سلجھی ہوئی زبان لکھتے ہیں۔ لیکن پس منظر بیان کرتے ہوئے ایسی دلچسپی پیدا کر دیتے ہیں کہ باوجود زبان کی یہی سادگی نفس موضوع کو مجروح کئے بغیر اسے حسن عطا کر دیتی ہے۔ دلچسپی کے باوجود حقیقت حقیقت ہی رہتی ہے افسانہ نہیں بن جاتی۔

دکنی تحقیقات کے علاوہ انھوں نے دور آصفی کے ادیبوں اور شاعروں پر بھی تحقیقی کام کیا ہے مرقع سخن کی جلدیں اس کی شاہد ہیں مگر یہ کام اہم ہونے کے باوجود ان کی دکنی تحقیقات کے مرتبہ اور اہمیت کا حامل نہیں۔۔ البتہ داستان ادب حیدرآباد اور حیدرآباد فرخندہ بنیاد ان کے مزید دو اہم کارنامے ہیں اور تحقیقی ادب میں اضافہ سمجھے جاتے ہیں۔۔ ان سب کے علاوہ کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو کے قلمی نسخوں کی توضیحی فہرستوں کی ترتیب ان کے تحقیقاتی سلسلے میں بے حد اہم سلسلہ ہے۔ اگرچہ ان کی زندگی نے وفا نہیں کی کہ وہ ان فہرستوں کو مکمل کر دیتے اور تمام جلدیں چھپ جاتیں مگر جتنا کام وہ کر گئے ہیں اس کے بعد ان کی تکمیل مشکل نہیں۔ ان توضیحی فہرستوں نے حیدرآباد سے باہر بلکہ بیرون ہندوستان بھی دکنی محققوں کے لئے نئی راہیں کھول دی ہیں اور بے حد اہم اطلاعات فراہم کی ہیں۔ ان توضیحی فہرستوں کو دیکھ کر ان کی تحقیقی نظر اور کام کی سطح کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسے صرف خانہ پری یا فہرست سازی نہیں کہا جا سکتا۔ تقابلی مطالعہ سے ہمیں ان فہرستوں کی افادیت کا اندازہ ہوتا ہے جو وضاحتی نوٹ انھوں نے لکھے ہیں وہ تحقیقی نظر اور اس دشت میں ایک عمر کی سیاحی کے بعد ہی ممکن ہیں۔ ان معلومات پر مزید تفصیل فراہم کی جا سکتی ہے۔ مگر انھیں رد نہیں کیا جا سکتا اس لئے اگر انھیں "دکنیات" کا امام کہا جاتا ہے تو کچھ غلط نہیں۔

حاضرینِ جلسہ! واقعہ ایک دن کا یہ ہے کہ میر حسن نامی ایک شخص اردو زبان کے اسٹیج پر صدر بنا بیٹھا تھا۔ کسی شاعر مرحوم کا یوم منایا جا رہا تھا اور تقریروں میں مرحوم کے اوصاف پسندیدہ کے گن گائے جا رہے تھے۔ ایسی عمدہ عمدہ بے شمار باتیں لوگوں نے کہیں کہ اگر بیچارہ مرحوم زندگی میں سن پاتا تو پھولے نہ سماتا۔ زمانہ کی کج ادائی کا شکوہ نہ کرتا۔ بلکہ اس کا بھی امکان تھا کہ وہ سن لیتا کہ لوگ اسے کس قدر اچھا سمجھتے ہیں تو سچ مچ اچھا ہو جاتا۔ پس خیال ہوا میر حسن کو کہ اگر زندگی میں ایسی قصیدہ خوانی کی جائے تو کیا ہی اچھا ہو۔ مارے خوشی کے عمر عزیز کے پانچ سات سال اور بڑھ جائیں۔ پھر اس کا بھی کیا بھروسہ کہ ہم جس طرح گزرے ہوؤں کو یاد کرتے ہیں لوگ ہمیں بھی یاد کریں۔ پرانے بادشاہ اسی بے اعتباری کے سبب اپنا مقبرہ جیتے جی ہی تیار کروا لیتے تھے۔ چنانچہ شخص مذکور نے حلقۂ احباب میں یہ بات چھیڑی کہ اس طرح ایک دوسرے کی تعریف و تحسین کی جائے۔ باقاعدہ ایک پروگرام بنے اور آپس میں سب ایک دوسرے کو بھلا کہیں اور سنیں۔ قرعۂ فال مخدوم کے نام نکلا کیونکہ اس کمبخت کے چاہنے والے اس شہر میں بے حساب و بے شمار ہیں، ہر طبقہ اور ہر گوشے میں پائے جاتے ہیں۔ ہم نے اس سلسلہ کا نام رکھا ہے "من ترا حاجی بگویم"۔

حضرات! چونکہ مخدوم کے چاہنے والے بیرون شہر و دیگر اقطاعِ ہند میں بھی پائے جاتے ہیں، اس لیے خیال ہوا کہ سب کو شرکت

ڈاکٹر زینت ساجدہ

مَن ترا حاجی بگویم

کا موقع دیا جائے۔ کیونکہ سب کی آرزو یہی تھی اس لیے سلسلہ زلف کی طرح دراز ہوا اور خدا معلوم کب دور دراز تک آتا کہ اچانک رمضان شریف آ پہونچے۔ اور اس کے بعد مخدوم اپنے ساٹھ سال پورے کر لیتا اس لیے جشن کا اعلان ہوا۔ مخدوم نہ اپنے آپ کو بوڑھا سمجھتے ہیں نہ لوگ سمجھنا چاہتے ہیں۔ تو اس لیے عین اس کی جوانی میں اس کا جشن منانا ٹھیک پایا۔ کچھ لوگ ایسے بھولے بھالے ہیں جو بڑی خوشی سے ذکر کرتے ہیں اور مبارکباد دیتے ہیں کہ لیجئے مبارک ہو، مخدوم ساٹھ سال کا ہو گیا۔ سنا آپ نے بال حیرت ہے مگر سچ مانیے یہ سن کر مخدوم کے دل پر سانپ لوٹ جاتا ہے۔ خدا جانے کب سے اس نے ٹرک کر رکھی ہے کہ اس کی عمر کا پہیہ الٹا گھوم رہا ہے۔ ہاں کبھی کبھی کوئی خاتون محترم اپنی جوان جہان بچی کو اس سے ملاتے وقت کہتی ہیں، بیٹا ملو یہ ہمارے ابا کے کلاس میٹ تھے۔ یا کوئی مرد بزرگ جن کے بالوں میں چاندی جھلملا رہی ہے بڑے خضوع و خشوع سے ہاتھ ملا کر کہتے ہیں آپ نے پہچانا نہیں، میں سٹی کالج میں آپ کا طالب علم رہ چکا ہوں تو بیچارے مخدوم کی عجیب حالت ہوتی ہے کیونکہ جب یہ لڑکیاں گرد و گرد ان کے سامنے سے گزرتی ہوں تو مخدوم بشرٹ کا کالر ٹھیک کر لیتا ہے اس لئے۔ اس معصوم کو ابھی تک یہی خیال ہے کہ وہ سب اسی کو دیکھ رہی ہیں۔ بات اسے دیکھ کر اتنی عجیب نہیں معلوم ہوتی۔ خدا معلوم اس نے اور اس کے ساتھیوں نے سری میوں کا کونسا نسخہ استعمال کیا تھا کہ برسوں سے اسے ویسے ہی اور وہ جوں کا توں، سدا بہار۔ میرا خیال ہے کہ ریلیز بکہدار اور تحفہ اس بنانے والی کمپنیاں مخدوم کو بطور اشتہار استعمال کر سکتی ہیں۔ چونکہ بزنس ہمارے بھائی ہے نفع نقصان نہ سہی ۱۵ فی صد رائلٹی کی

سے دوچار ہوتا۔

ہر ایک شخص جشن مخدوم میں اس کی قصیدہ خوانی پر تلا ہوا ہے۔ سن سن کر جی جلا اور جل بھن کر کباب ہوگیا کیوں نہ جلیں، دیسے بھی مخدوم سے جی جلتا ہے۔ مغلپورہ کے نوابوں سے لے کر چیچلی کے مزدوروں تک جس کو دیکھو فیشن سا بنا لیا ہے کہ مخدوم کی محبت میں دم بھرتا رہتا ہے۔ سال بھر میں وہ ایک ہی غزل یا نظم کیوں نہ کہے، سارا شہر اسے منہ زبانی پکا پانی یاد کر لیتا ہے۔

حیدرآبادیوں کی تو خیر مخدوم کمزوری بن گیا ہے افیون کی طرح وہ اس کے عادی ہو گئے ہیں مگر نو وارد آندھرا کے نوسکھ بھی لہرا لہرا کر "منڈیلی کے جلیبی تلے" گنگناتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ اردو سیکھ گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان باتوں نے اس کا دماغ اور بھی خراب کر دیا ہے۔ ایک تو شاعر ہے ویسے ہی اتراتا ہے، پھر ان تعریف والوں نے تو ناس ہی مار دیا اس کا۔ کریلا اور نیم چڑھا بن گیا۔ اس لیے میرا جی چاہتا ہے کہ سب تعریف کریں، تو میں ہجو گوئی پر اتر آؤں تاکہ تریاق کا کام کرے۔ گھر میں بھی اس کی حمایت مشکل ہے چاہنے والے ہر گھر میں جو موجود ہیں۔ اس لیے یہاں زیادہ محفوظ ہوں، اسٹیج پر ایک نہیں کئی صدر تشریف فرما ہیں۔ جان و مال کی حفاظت کی امید ہے۔

مخدوم اصل میں سخت کینہ ہے دیکھیے کئی سال ہوئے میں نے اس سے کہا تھا کہ ایک غزل لکھ دے تاکہ میں مشاعرے میں پڑھ کر داد وصول کر سکوں۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے شاعروں پر داد واہ 'سبحان اللہ' مکرر ارشاد' تعریف و تحسین کے ڈونگرے برسائے جاتے ہیں تو پھر جی للچا ہی اٹھتا ہے۔ مخدوم نے فوراً حامی بھر لی تاکہ تازہ کلام مجھے دے دے گا لیکن حال یہ ہے کہ شعر کا لفظ لفظ جس طرح وارد ہوتا ہے لوگوں کو سنانے لگتا ہے۔ پاؤ مصرعہ، آدھا مصرع، پون شعر اور پورا شعر، ہر منزل پر سناتا جاتا ہے اطراف لوگ نظر آئیں تو فون پر سنائے گا۔ فون پر کوئی سننے والا نہ ملے تو لوگوں کے گھر جائے گا۔ پیسہ نہ رکھا کر رکشا کا کرایہ چپکی وصول کرے گا۔ پھر روپیہ بھی ہضم کر جائے گا اور شعر سنائے گا۔ اگر کوئی ڈھنگ کا سننے والا نہ ملے تو راستہ چلتے آدمی کو روک کر سنائے گا بلکہ اسے دیکھ کر آدمی خود سننے رک جائے گا۔ کوئی نہ ملے تو رکشا والے کو سنائے گا۔ ننھے منے بچوں کو سنائے گا۔ غرض وہ اسی طرح غزل یا نظم کے تمام ہونے سے پہلے ہی اس کا ہر لفظ کئی بار سینکڑوں کو سنا چکتا ہے اس کا کلام مرض متعدی ہے۔ سننے والے دوسروں کو سنائیں گے اس طرح حیدرآباد کی ساری پبلک طوطے کی طرح اس کا کلام رٹ لیتی ہے اس طرح تازہ غزل مجھ تک پہنچنے سے پہلے سب کو زبانی یاد ہو جاتی ہے سو بھر آپ ہی بتائیے کہ میں نہ کہوں تو اسے کیا کہوں۔ میر کے کلام سے سرقہ کرنا آسان ہے، ممکن ہے کسی کو پتہ نہ چلے لیکن مخدوم کا آدھا شعر بھی چوری کر لیجیے اور کسی کو سنائیے تو سننے والا بقیہ آدھا سنا کر کہتا ہے مخدوم نے کیا خوب کہا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو والے بھی خواہ اس کا کلام نشر کرنے سے بچتے ہیں۔ اس کا کیا بگاڑ لیتے ہیں۔ خود ہی بدنام ہوتے ہیں وہ تو بذات خود ریڈیو اسٹیشن ہے اور بار بار، پیہم اپنا کلام اس طرح نشر کرتا ہے کہ دور و نزدیک سب نہ صرف سن لیں بلکہ سن کر یاد رکھنے پر مجبور ہو جائیں۔ اور جب کسی محفل میں سنانے کی فرمائش ہو تو وہ بے حد بچنے کی کوشش کرے گا۔

بھئی! یاد ہے پبلک کے بے حد اصرار پر سناتے سناتے اٹک جائے گا اور پبلک ایک آواز ہو کر جب اسے یاد دلائے گی تو اصیل مرغ کی طرح اکڑ کر ادھر ادھر فخر سے دیکھے گا۔ دیکھا آپ نے شاعری اس کو کہتے ہیں اور دوسرے شاعر بے چارے غم زدہ ہو کر اپنی ناقدری کا غم بھلانے کے لیے بدنے لگتے ہیں کسی شاعر کو بھی اپنے شعر کی اس طرح سر آنکھوں پر نہیں بٹھاتے، ایسی مزا ہی لا کھیں کرتے، مخدوم نے کہا ناس اس کا دماغ خراب کر دیا ہے، گھر کی مرغی دال برابر سمجھا ہی نہیں۔ صدیوں تک ناقدری لا اپنا شے وطن

کی روایت توڑ دی ہے یعنی داقعی حد ہے ۔ وہ روز سناتے اور سال بھر تک وہی ایک چیز سنا رہے ہے تو بھی ہم تن گوش بن جاتے ہیں ۔ خدا جانے کون سا منتر پڑھ کر پھونک دیا ہے اکتانے کا نام نہیں لیتے ، باسی ، پرانی ، بوسیدہ غزلیں تک شوق سے سنتے ہیں اور دوسرے شاعروں کی سائیکلوجی خراب ہوتی ہے ۔

اصل میں اس کی آواز میں جادو ہے ۔ گھن طرح دار ، خوددار ، چبھتی ہوئی آواز ۔ جب غزل چھیڑتا ہے تو آپ ساز بن جاتے ہیں اور لیلاؤں کی رات بن جاتا ہے جگمگاتا ہوا ۔ چاندنی سا جل اٹھتا ہے مگر جہاں آپ نے شوق کا اظہار کیا کہ لگے .... نخرے دکھانے ، اصرار کیجئے کہ غزل ترنم سے سناؤ تو تحت اللفظ پڑھے گا ۔ بے سروں کو تو گانے کا شوق ہے مگر اس کا حال یہ ہے کہ ذرا آواز کی تعریف کی اور یہ تحت اللفظ پر اتر آیا ۔ میرا خیال ہے جشن مخدوم میں ایک ریزولیشن پاس کر دیا جائے کہ مخدوم جب سنائے ترنم سے سنائے ۔ مجھ سے عرب ملکوں کی سیاحت کر کے آنے والے ایک سیاح نے کہا " ام کلثوم ! ہائے آواز اس کی ۔ ساٹھ برس کی ہو چکی مگر آواز کا جادو نہیں ٹوٹتا " میں نے کہا آپ نے مخدوم کو نہیں سنا ۔ ساٹھ برس سے تو ہم ہی سن رہے ہیں ۔ مگر آواز کا کلف نہیں ٹوٹتا ۔ بلکہ ابرق سی چمکنے لگی ہے ۔

ریزولیشن کی بات آئی ہے تو ایک ریزولیشن اور پاس کرنا ہوگا ۔ وہ یہ کہ جب بھی ادبی محفلوں میں مخدوم آئے تو اپنی لمبی تقریروں سے بور نہ کرے ، نظم سنایا کرے ۔ مروت میں لوگ اس کی تقریروں کو جھیل لیتے ہیں تو سمجھتا ہے کہ اس کی تقریر سننے کے لئے بیٹھے ہیں حالاں کہ سب اس انتظار میں ہوتے ہیں کہ اس لمبی تقریر کے بعد شعر سنائے گا ۔ تقریر سننی ہے تو راج سبھا میں سن لیں گے ۔ ہمارے لئے مخدوم شاعر ہے اور اس کا شعر سننے کے لئے ہم آتے ہیں ۔ تقریریں وہ ادب کی سرحد کے پار جلسے جلوسوں میں کر سکتا ہے ۔

مخدوم شاعر بھی ہے شخصیت بھی ، جادو بھی ہے اور جادوگر بھی ۔ مگر ہے بڑا بہروپ ۔ اس کا اعتبار مشکل ہے وہ جب نہایت سنجیدگی سے باتیں کرتا نظر آئے تو سمجھ لیجئے کہ کسی کو بنا رہا ہے اور سننے والے کو خبر بھی نہ ہوگی ۔ آندھرا پردیش بنایا جا رہا تھا ایک خاتون اردو سے بالکل ناواقف ، اپنی دانست میں بے حد باشعور ایک محفل میں مخدوم کو شعر پڑھتے سن کر بے حد متاثر ہوئیں ۔ آواز یقیناً کانوں میں رس گھول گئی ہوگی .. شفقت سے پوچھا آپ کیا کام کرتے ہیں ۔ مخدوم نے سوکھا منہ بنا کر مظلومیت سے دکھڑا رو دیا کہ بے کار ہوں ۔ بے چاری ریڈیو اسٹیشن میں کام دلانے کا پکا وعدہ کر بیٹھیں اور مخدوم نے اس کی سرپرستی کے انداز کو اور شہ دی ۔ انگلش میں ان سے بات کرتا اور اردو میں کمنٹری دیتا جاتا ۔ پاس بیٹھنے والوں کا برا حال تھا ۔ ایکٹنگ تو اس کے لئے فطری تھی ۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تو لال مخدوم ہے تو پھر نام سے ہی بدک گئیں ۔

وہ تو خیر ۔ مگر یہ سردار جعفری ۔ خاصا پہلوان آدمی ہے وہ بھی جھانسے میں آ گیا ۔ جب مخدوم نے اپنی آواز کا سلسلہ یعنی حضرت بلال حبشی سے ملایا تو انہوں نے اپنے مضمون میں لکھ مارا اور شاید آج تک خبر نہ ہوئی ۔ حالاں کہ یہ چار سو بیس صحیح جا بیٹھا ہے ، سقراط بقراط بن جاتا ہے جیسا بیٹھا ہے قلو پطرہ اور قرۃ العین کا عاشق یہ تو دلّی کی راجدھانی جیسا ہے جس نے کبھی کسی سے سچی بولانہ وفا کی ۔ مگر لوگ بھی خوب جانتے ہیں کہ وہ سنجیدہ باتیں لطیفوں کی طرح بیان کرتا ہے اور گپ مارتے وقت افلاطون کی طرح سنجیدہ اور ذی شعور نظر آتا ہے ۔ وہ بھی جو ہمیشہ سے اسے جانتے ہیں بلیا کر تو بیچتے ہیں ، کھسیاتے ہیں ۔ وہ تو گرگٹ ہے جب دیکھئے ایک نئے رنگ میں نظر آتا ہے ۔ اعتبار ہی نہیں کیا جا سکتا کہ اس بہروپیے کا سچا رنگ کون سا ہے ۔

مخدوم اپنی مقبولیت پر آپ نازاں ہے کہ مجھے سب چاہتے ہیں ۔ چاہیں نہیں تو جائیں کہاں ۔ جو آپ کے سر پر سوار ہی ہو جائے ۔ اسے سر پہ بٹھانا ہی پڑتا ہے ۔ کوئی گھر ایسا نہیں کہ جہاں وہ نہ جا سکتا ہو ۔ عورتوں میں عورت ، مردوں میں مرد ، سیاست والوں میں اپوزیشن لیڈر اور بچوں میں شرارتیں کا معشوق ۔ عام طور پر اسے نہایت بد گرہ قسم کی عورتوں سے بگھارے بیگن یا انڈوں کے کٹ کی فرمائش کرتے اور

اغاڑے کے اچار کی ترکیب پوچھنے سنا ہے۔ مخدوم کو اپنے بلیو بلیک حسن پر بڑا ناز ہے اب تو بنے بھائی نے اسے احتیاط کی مورتی قرار دیا ہے تو خدا جانے اور کیا مزاج دکھائے۔ پہلے ہی سے وہ اپنے آپ کو دکن کی سنگلاخ چٹانوں سے تراشا صنم سمجھتا ہے۔

مگر مخدوم سخت کافر ہے بُرا بھلا کہہ کر بھی عزیز رکھنے کو جی چاہتا ہے ایک بار شام بہاراں میں' میں نے اسے کافر کہہ دیا تھا تو دوسرے ہی دن کئی مولویوں نے خطوط بھیجے اور بُرا بھلا کہا۔ لکھا تھا غزل کا کافر ہے سچ مچ کا کافر نہیں۔ انھیں یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن راہِ راست پر آجائے گا۔ عوام بھی کہتے ہیں دہریہ ہے تو کیا ہوا۔ دیکھ لیجئے۔ بڑے پیر کے نام کی برکت سے کیا نام نکالا ہے یہ سب مَن اَمن کردہ مُرشد ہے۔ مُرشد لفظ بھی زبان میں نہایت بلیغ ہے اور وہ مخدوم پہ صادق آتا ہے۔ اب بھی دیکھئے کل سے مُرس رہا ہے۔

مجھے آج سروجنی نائیڈو کی بیٹی لیلا منی یاد آ رہی ہے۔ کالج ہال کی تقریب ہو وہ سب سے آخر میں نیشنل انتھم کی فرمائش کرتیں۔ "وہ خم گردن' وہ دست ناز' وہ ان کا سلام" مگر صفت ہے مخدوم پہ جس کے لئے ایسے قدر دان رہے ہوں' وہ اپنی قدر گنواتا ہے' کچھ کہیے تو ناراض ہوتا ہے۔ لڑنے مارنے مرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے جی چاہتا ہے وہ مقطع کہے کتنا اصرار پر لکھا۔ مگر بد ذوقی کی حد ہوتی ہے' جسے چاہا ہے شعلہ رخ' شعلہ بدن بنا دیتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ سائگر کا اثر چہرے مہرے پر نہیں آنکھوں اور کانوں پر ضرور ہوا ہے۔ آنکھوں کے اتنے اچھے' اچھے ڈاکٹر شہر حیدرآباد میں موجود ہیں وہ یقیناً مخدوم کو بھی جانتے ہوں گے انھیں کیسے گوارا ہے کہ ان کی دور' دور تک بدنامی ہو۔ اب بھی وقت ہے کہ ایک عینک اور ایک سماعت کا آلہ اس کی نذر کیا جائے۔

اس کا مجموعہ "بساطِ رقص" ابھرا ہو گیا ہے کچھ نظمیں تو بالکل راک اینڈ رول کرتی معلوم ہوتی ہیں بلکہ ٹوسٹ اور شیک۔ اس لیے جب سے جدید ایج اسمارٹ لڑکیاں مخدوم کو سننے اور اڈ مائر کرنے آتی ہیں اور ڈاؤن ہونے لگتی ہیں کہ اللہ کتنے سویٹ ہیں مخدوم صاحب تو میں خطرے کی گھنٹی بجا رہی ہوں۔ وہ جو سفید سر والے بزرگ راج بہادر گوڑ بیٹھے ہیں نا ان سے مخدوم فل ٹین ایجر بڑے ہیں اور کئی نواسے نواسیوں کے نانا حضرت۔ وہ بڑے بے اعتباری سے "اوکوش" کہہ کر نکل جاتے ہیں اور وقت کے سر پر سے خطرہ ٹل جاتا ہے خدا معلوم مخدوم کیوں نہیں سوچتا کہ اندر شاعر چلا ہے فخر کرتا مگر مخدوم کو لوگ چاہتے ہیں تو اس سے کچھ معیاروں کے طلبگار بھی ہیں۔

مگر معلوم نہیں کیوں ہنسنے' بولنے اور کھکھلانے والا مخدوم شعر سناتا ہے تو مجھے بالکل تنہا نظر آتا ہے۔ تنہا مسافر شب گزیدہ' جو اپنے دل کا چراغ جلائے سب کے لئے راہ تلاش کر رہا ہو۔ آپ اس کی باتیں سن کر ہنستے ہوں گے مگر شعر سن کر جیسے دل پگھلنے لگتا ہے۔ اسی لئے کافر ہے' کمینہ ہے' سب کچھ ہے مگر بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں۔

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

بقیہ سلسلہ :- "میرے گھر کی بہو"....

نوابوں کے بیکار خاندانوں کی زینت نہیں ہے۔ وہ پردہ نہیں کرتی۔ سماج میں مرد کے برابر کی حیثیت رکھتی ہے۔ ملازمت کرتی ہے مگر پھر بھی ایک متوسط گھرانے سے وابستہ ہے وہ ایک سلیقہ مند' سگھڑ' کھانے دھانے والی میرے گھر کی بہو ہے لیکن پھر بھی عورت ہے اور شاید یہی زینت ہے۔

ڈاکٹر زینت ساجدہ

چلی گئی گرمی...........

جب بیلا پھولے آدھی رات

اب تو واقعی افسوس ہو رہا ہے کہ گرمی چلی گئی لیکن جب گرمی تھی تو ہائے ہائے کرتے دن گزرتے تھے۔ جسے دیکھئے شکایت کر رہا ہے، دماغ پگھل رہا ہے، پسینہ بہہ رہا ہے اور دل پریشان ہے لیکن اب سوچتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ گرمی بھی سو نعمتوں کی ایک نعمت ہے ـــــ قدر نعمت بعد زوال۔ آدمی کم بخت ایسا واقع ہوا ہے کہ کسی حالت میں خوش نہیں رہتا۔ اے اللہ توبہ اور ہزار توبہ۔ اب کی گرمی آئے تو سر آنکھوں پر۔

ادھر گرمی کی لہر فضا میں سرایت بھی نہیں کرتی کہ گرم کوٹ اتر گئے۔ جڑ کالے (سرما) کے بھاری بوجھل کپڑوں سے نجات ملی، راتیں آم کے بور سے مہک اٹھیں۔ پچھلے پہر کی کوئل ٹھہر ٹھہر کر کوکنے لگی۔ اہل دل نے کلیجہ تھام لیا۔ کبھی کبھی سویرے آنکھ کھلی تو طلوع سحر کا نظارہ کرنے باہر نکلنے کی ہمت ہوئی، چہل قدمی میں مزا آنے لگا۔ شامیں سہانی ہو گئیں۔ گرمی جیسے جیسے بڑھنے لگی چاندنی چھٹکی چمک اٹھی حدت میں جوں جوں اضافہ ہوا راتیں معطر ہو گئیں۔ بیلا، چنبیلی، موتیا اور رات کی رانی پر بہار آ گئی۔

سردیوں میں تو شریف آدمی کو جمعہ کے جمعہ نہانا بھی بار گزرتا ہے لیکن ادھر گرمی شباب پر آئی کہ روح نے میلا چولا بدل ڈالا۔ صبح شام نہانے، تیرنے اور اُجلے براق کپڑے پہننے کا شوق ہوا، جسے دیکھو صاف ستھرا، اُجلا اُجلا نظر آتا ہے۔ ململ، جالی اور ڈوریے کی مانگ بڑھ گئی۔ دھوبی اترانے لگے۔ عید کے چاند کی طرح اس کا انتظار رہنے لگا۔ دالان کے تختوں پر جو سیلی سیلی سوزنیاں بچھی رہتی تھیں اٹھا دی گئیں اور چھپا چھپ چوکیوں پر چاندنی کا فرش ہو گیا۔ آنگن جھاڑ جھوڑ کے صاف کئے گئے۔ دن ڈھلتے تپتی مٹی پر چھڑکاؤ ہوا تو سوندھی سوندھی مہک اڑنے لگی۔ چارپائیاں، پلنگ اور تخت کمروں سے نکل کر پہلے دالانوں میں آئے اور پھر کھسکتے کھسکتے صحن میں پہونچ گئے۔ بستر پر سفید چادریں، سیجوں پر موتیا کے پھول، ہاتھوں میں گجرے، اور جوڑوں میں وینیاں سج گئیں۔ راتوں میں دیر گئے صحن میں بیٹھے گپ شپ اڑانے اور باہر کرسیاں بچھائے احباب کے ساتھ تاش کھیلنے کو جی چاہنے لگا۔

سردیاں تھیں تو پانی پینے کو جی ترستا تھا لیکن پی نہیں پاتے تھے، دانت بجنے لگتے تھے، اب برف کا پانی جی بھر پیا لیکن تشنگی

ہے کہ کم ہونے نہیں پاتی۔ کوری کوری صراحیاں اور مٹی کے گھڑے گھڑونچیوں پر قطار در قطار نظر آنے لگے۔ فالودہ، لسی، ٹھنڈے میٹھے شربت سے تواضع کی جانے لگی۔ خس اور کیوڑے سے کپڑے بسائے گئے۔ ہلکے رنگ کے چنے ہوئے دوپٹے، ان پر کہیں کہیں ابرق کی چھینٹ، معطر معطر، خراماں خراماں امرائیوں میں ٹہل رہے ہیں۔ نیم کی چھایا میں تھکے ہارے مسافر سستا رہے ہیں۔ آم اور املی کے گھنے پیڑ پر جھولے پڑ گئے۔ برسات سے زیادہ گرمی کی چاندنی میں جھولنے کا لطف آتا ہے۔

ان سب باتوں کو چھوڑ بھی دیجئے تو ایک نعمت ایسی ہے جس پر لاکھوں نعمتیں قربان، اور وہ ہیں آم۔ آم تخمی آم، قلمی آم سپیدہ، لنگڑا، نیلم، مغلوبہ، دل پسند، پدّارسال، بے نشان۔ چھوٹے بڑے قسم قسم کے اور مزے مزے کے آم۔ پھلوں کی دکانوں پر رونق آگئی۔ امیر سے لے کر غریب تک ہر ایک نے آم سے لطف اٹھایا۔ معلوم نہیں جنت میں آم ہوں گے کہ نہیں۔ نہیں تو دنیا سے پارسل اور بھنگی سگوانی پڑے گی۔ اور بھی ابھی تحقیق نہیں ہوئی کہ چاند کی سرزمین پر آم کی فصل ممکن ہے کہ نہیں۔ ٹھیکہ دار کمپنیوں کے لئے زرین موقع ہے۔ اس دنیا سے اُس دُنیا کی بزنس کا ٹھیکہ لے لیں، سر کڑھائی میں ہوگا۔ بڑے کام کی بات بتادی ہے ہم نے۔ پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔ پہلے ہی سے حقوق محفوظ کروالیجئے ورنہ ٹنڈر بھرنے کا مقابلہ ہوگا اور مفت میں دولت ہاتھ سے جائے گی۔

اس موسم کا فائدہ سب سے زیادہ بچوں کو پہونچتا ہے۔ اِدھر گرمی شروع ہوئی اور اُدھر اسکول بند، چلنے پڑھنے پڑھانے سے چھٹی ملی۔ لاکھ سمجھائیے کہ گرمی کی دوپہر میں سونا چاہیئے۔ دھوپ میں گھومنے سے لو لگتی ہے، چھٹیوں کو غنیمت سمجھ کر کچھ پڑھ پڑھا لو لیکن وہ بھلا کس کی مانتے ہیں۔ اِدھر بڑے بوڑھوں کی آنکھ لگی اور اُدھر غائب۔ غلیل چلانے، چڑیاں پھنسانے اور گرگٹوں کا شکار کرنے کا بہترین سیزن یہی ہے۔ یہی نہیں قلفی ملائی اور آئس فروٹ والے کی صدائیں بھی باہر کی طرف دامن دل کھینچتی ہیں۔

امیروں اور تونگروں کے لئے تو یہ موسم ہزاروں ارمانوں، تمناؤں، منتوں، مُرادوں کا ہے۔ ہوا بدلنے، پانی بدلنے، دل بہلنے اور دماغ بدلنے کے لئے میدانوں سے اُٹھے تو پہاڑوں پر چڑھ کر ہی دم لیا۔ جتنا زیادہ جیک بیلنس ہے اتنی ہی بڑی چڑھائی ہے۔ کچھ بے چارے تو یہیں کہیں آس پاس باولیوں، باغوں، تالابوں اور امرائیوں تک گھوم آئے۔ کچھ آگے بڑھے تو وقار آباد اور علی ساگر ہو آئے جن کی جیب گرم ہے وہ من کو گرم اور تن کو ٹھنڈا رکھنے کے لئے کوڈی اور اوٹی پہونچ گئے۔ نینی تال اور مسوری کا رُخ کیا اور کشمیر جنت نظیر کی سیر کر کے آئے۔ اور جو ان سے بھی آگے ہیں وہ اُڑے تو سیدھے سوئٹزرلینڈ پہونچے۔

گھر کی سلیقہ مند عورتوں کے لئے بھی یہ موسم اپنے جلو میں سینکڑوں دلچسپیاں لئے آتا ہے۔ دن لمبے ہوئے تو سو کام نکلے اب یہ فکر نہیں رہی کہ صبح اُٹھے نہیں کہ ناشتے کا بندوبست کرنا اور ابھی اس سے فراغت نہیں ملی کہ بچوں کو اسکول اور میاں کو دفتر بھیجنے کا وقت آگیا۔ اس جھنجھٹ سے نمٹے ہی تھے کہ دوپہر کے کھانے کی تیاری شروع ہوگئی۔ اب ہر کام فرصت سے ہو جاتا ہے۔ لمبی دوپہر کبھی کمر سیدھی کرلی کبھی سال بھر کی سلائی لے کر بیٹھ گئیں۔ بگھڑ بیٹیوں کے ہاتھ میں سوئی دھاگا آگیا، کڑھائی ہو رہی ہے۔

بھئی سچ پوچھئے تو اس موسم میں ہر ایک کے لئے راحت ہی راحت ہے۔ مفت میں ثواب کمانے اور عاقبت سنوارنے کا شوق ہو تو بسم اللہ یہ شوق بھی پورا کر لیجئے۔ محنت اور روپیہ بھی کچھ زیادہ درکار نہیں۔ دو چار مٹی کے گھڑے، ایک آدھ آبخورہ خرید لیا اور سبیل لگا بیٹھے۔ راہ چلتوں کو پانی پلایئے اور اعمال نامے میں ٹھنڈے عمل لکھوایئے۔ ہینگ لگے نہ پھٹکری رنگ چوکھا آئے۔

لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے ناکہ اثر بت بھی کسی کے لئے زہر کا حکم رکھتا ہے۔ یہ بات یہاں بھی صادق آتی ہے۔ ایک بدنصیب "قوم" ایسی ہے جسے نہ گرمی کی آمد سے خوشی ہوتی ہے اور نہ اس کے چلے جانے پر سکھ کا سانس لینا نصیب ہوتا ہے اور وہ "قوم" ہے استادوں کی۔ ہمارا تو خیال بلکہ ایمان ہے کہ پچھلے جنم میں جنھوں نے بدترین گناہ کئے تھے انہیں اللہ میاں نے استاد بنا ڈالا۔ کم تنخواہ زیادہ کام اور اس سے زیادہ بدحالی اور پریشانی اور طرفہ تماشا یہ کہ اس نیک اور قابل احترام پیشے میں روپیہ اور آرام نہ سہی نام اور مقام بھی نہیں۔ ان بے چاروں کو گرمی کی راحتوں سے کیا لینا دینا۔ ادھر کوئل کی کوک سنائی دی اور ادھر کی مہک ناک میں آئی کہ دل کو دھکا لگا۔ امتحانوں کا موسم آیا ہے۔ بچوں کو رٹانے کے لئے نوٹس بنانے ہیں۔ گھونٹ گھونٹ کر آموختہ پڑھانا ہے، امتحان کے لئے پرچے بنانے ہیں، امتحان شروع ہو جائیں تو ٹہل ٹہل کے چوکیداری کرنی ہے۔ پہلے تو صرف ٹہلنے کی سزا تھی لیکن اب عزت آبرو اور جان و مال کو بھی خطرہ ہے۔ طالب علم نقل یا آپس میں بات کریں تو پکڑو اور نہ پکڑو تو پکڑے جاؤ۔ پکڑو تو ڈر ہے کہ کوئی تنو مند طالب علم سو کھے مارے اُستاد کو کھڑکی سے باہر نہ پھینک دے، چھوڑا ہے پر نہ پٹوا دے۔ بمشکل سی مشکل ہے۔ اس سے چھٹکارا ملے تو جوابی بیاض دیکھنی ہیں ـــــ گرمی کا موسم، نیند سے آنکھیں بوجھل، دماغ کام کرنے سے انکار کر رہا ہے لیکن ایک ہی غلطیاں بار بار پڑھے جائیے۔ جوں توں یہ مہم سر ہوئی تو نتیجے کا بھوت سر پر سوار ہو گیا۔ اچھا نتیجہ نکلا تو عہدہ دار اور طلبہ سب مطمئن کہ ان کی محنت ٹھکانے لگی اور خراب ہوا تو کم بختی استادوں کی۔ ادھر ماں باپ کو سیں اُدھر اُوپر والے دھمکیاں دیں۔ ان سب سے نمٹ کر اطمینان کا سانس لینے اور پاؤں پھیلا کر سونے کا خیال ہی آیا تھا کہ معلوم ہوا گرما کی تو کب کی چلی گئی۔ پھر اسکول کھلیں گے داخلوں کا دھندا شروع ہوگا۔ افسوس صد افسوس، سنا تو ان لوگوں نے بھی ہوگا کہ گرمی کے موسم میں خس کی ٹٹی اور پروا ہوا بڑا لطف دیتی ہے لیکن ان کی قسمت میں راحت کا یہ باب ہی نہیں، کبھی کبھی گنگنا لیتے ہیں، جب بیلا پھولے آدھی رات . . . . . .
کون جانے کس کے لیئے۔

نظر نواز اور شاندار احساس کیلئے

ہاتھ سے بُنے ہوئے ہمہ قسم کے شاندار سلک، ملائم آرام دہ کاٹنس، پالیسٹر، ٹری کاٹن، جگمگاتا ساڑیاں اور دھوتیاں اور

آپ کی خوش لباسی اور آن بان کے لیئے

ھمارے فروخت کے ۴۴۰ مراکز پر تشریف لاکر اپنی پسند کے چند شاندار فیشن کے پارچے منتخب فرمایئے

آپکو فیبرکس آپ کے بجٹ کے لحاظ سے آپ کی پسند کے کپڑے فراہم کرتا ہے۔

دی آندھرا پردیش اسٹیٹ ہینڈلوم ویورس کوآپریٹیو سوسائٹی

پائیگا پلازا۔ بشیر باغ۔ حیدرآباد 500029

ڈاکٹر زینت ساجدہ

خدا جانے کیوں بیٹھے بیٹھائے مجھے خیال آیا کہ مرغیاں پالی جائیں۔ کٹ کٹ کرتی ادھر اُدھر پھریں گی، آنگن بھرا بھرا لگے گا اور رونق آجائے گی۔ ادھر میرے جی میں یہ بات آئی اُدھر میں نے اعلان کر دیا کہ اب اس گھر میں مرغیاں پلیں گی۔ سب تو یونہی ہنسنے لگے کہ بھئی شوق ہو تو کوئی ڈھنگ کا ہو۔ یہ کیا تم مرغیاں پالنے چلی ہو، شادا سے مگر دادی اماں نے صاف کہہ دیا کہ مرغیاں ہمارے ہاں پل نہیں سکتیں، راس نہیں۔ بس جب دیکھو تب دادی اماں کے یہاں یہی عذر موجود رہتا ہے کہ یہ نہ کرو راس نہیں اور وہ نہ کرو راس نہیں۔ خدا جانے یہ کیوں نہیں کہتیں کہ چلو زندگی ختم کر دو یہ بھی راس نہیں۔ اب لگیں واقعات گنوانے، راشد نے ایک دفعہ ننھے میاں کی پیدائش سے پہلے دس بارہ مرغیاں پالی تھیں۔ وبا آئی، ساری مر گئیں۔ شمسہ نے گاؤں میں سو سے زیادہ پولٹری رکھی تھی. ایک سے ایک مرغی خوب صورت اور بانکی مگر وہ ساری یا تو چوری گئیں یا مرکھپ گئیں۔ اب بھلا یہ جھنجھٹ کون مول لے۔ محنت اکارت جائے تو خواہ مخواہ دکھ ہو۔ مجھے یہ سب کچھ سن کر غصہ ہی آگیا۔ محض اتفاق کی بات ہے کہ مرغیاں مر گئی ہوں گی، چلو انہوں نے قاعدہ کلیہ بنا لیا۔ میں تو پال کر ہی رہوں گی، ضرور پالوں گی، کب تک یونہی اوروں کی لاٹھی پکڑے راستہ ٹٹولوں۔ کچھ اپنی ہمت پر بھی بھروسہ ہونا چاہئے۔ زندگی تجربات کا نام ہے اور تجربوں کا آغاز یہیں سے سہی۔

خیر ارادہ تو میں نے کر لیا۔ یوں بھی ارادہ کرنا ہمارا کام ہے خدا اسے پورا کر ہی دیتا ہے۔ منگل کے دن میں نے بندو کو منگل ہاٹ بھیجا اور دو مرغیاں منگوائیں۔ مناسب یہی معلوم ہوا آغاز چھوٹے پیمانے پر ہی کیا جائے ۔ یہ مرغیاں بھی شاید جنگ لڑنے جا رہی ہیں۔ تب ہی تو اتنی مہنگی ہو گئی ہیں۔ بندو مرغیوں کی قیمت دے کر ہاٹ سے دو ننھے ننھے چوزے لیتا آیا۔ انہیں دیکھ کر سب ہنسنے لگے۔ مجھے بڑا برا لگا مگر میں کب ہار ماننے والی ہوں۔ میں نے بھی اطمینان اور مصنوعی خوشی ظاہر کرتے ہوئے کہا اچھا ہوا کہ چوزے لے آئے

بہت جلد بل جائیں گے اور اگر دیکھ بھال کروں گی تو جلد ہی بڑے ہو جائیں گے۔ بڑے پیار سے میں نے انہیں دانا کھلایا۔ تو گرفتار گھبرائے گھبرائے اِدھر اُدھر دوڑے دوڑے پھرتے۔ ماں کی پنکھ سے کتنی جلدی جُدا ہو گئے تھے۔ قسمت انہیں کہاں سے کہاں کھینچ لائی تھی۔ یہاں زمین آسمان سب ان کے لئے نئے تھے۔ اس لئے سہمے سہمے پھرتے تھے۔ جیسے کوئی نئی نویلی دُلہن سسرال آئی ہو۔ اور ذرا سی آہٹ سے چونک جائے۔ مگر پیار میں وہ قوت ہے کہ جانور بھی رچ جاتا ہے۔ انہیں گود میں اٹھا لیتی، سینے سے لگاتی، پیار کرتی اور ان کے دانہ پانی کا خیال رکھتی۔ دحشت رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی۔ گھر سے مانوس ہونے لگے، جوں ہی میں قیمے کی گولیاں بنا کر آواز دیتی دونوں دوڑے دوڑے آتے، پر پھڑپھڑاتے، گردن لمبی نکال کر اپنی گول گول آنکھوں سے دیکھتے، جن میں اب اجنبیت نہیں رہی تھی۔ میں انہیں وہ سب کچھ دے رہی تھی جو ایک انسان حیوان کو دے سکتا ہے۔ اس کے بدلے شاید ان کے پاس گونگی محبت تھی۔

دن گذرتے گئے۔ الحمد للہ دونوں پلتے رہے۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں اس حاسد آسمان کی نظر نہ لگ جائے بس بیٹھے بیٹھے دعائیں مانگتی کہ یہ ہر شر سے محفوظ رہیں اور ایک سے لاکھ ہو جائیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں نے پر پرزے نکالنے شروع کئے۔ چوزے پن کا دور سلامتی سے ختم ہو گیا، اب مرادوں کے دن لگے۔ ایک مرغا بنا اور ایک مرغی۔ مرغا کیا سینہ تانے، بازو پھیلائے، اکڑا اکڑا پھرتا اور مرغی ڈری سہمی لجائی شرمائی اس کے ساتھ ساتھ ہوتی۔ اب دانا کھانے میں دونوں کی لڑائی نہ ہوتی۔ مرغی دانہ چُگتی اور مُرغا فخریہ انداز سے سینہ تانے کھڑا رہتا۔ کیوں نہ ہوتا آخر میرا مُرغا تھا۔ سوسائٹی کے سارے آداب سے واقف اب یہ اور بات ہے کہ میں ذرا بھی تہذیب والی نہیں۔

پہلے پہل ہمارے گھر کا بِلا وڈو بڑا کو دنا پھاندنا اور غراتا رہا۔ محبت میں شرکت کسی کو گوارا نہیں مگر میں نے بھی اس کو خوب سمجھا دیا کہ بھائی ہمارے گھر میں تمہارا گزارا اس وقت ہو سکتا ہے کہ ـــ تم سمجھوتہ اختیار کرو۔ میری مرغیوں کے آگے آنکھیں نہ چمکاؤ، اگر اچھا سلوک چاہتے ہو تو ان سے دب کر رہو میں انہیں چاہنے لگی ہوں، تم بھی انہیں چاہا کرو۔ بس پھر میں تم سے خوش رہوں گی۔ تمہارے معمول میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ ہمارا بِلّا بات پہچانتا ہے، موقع محل جانتا ہے، اس نے بھی اپنی بھلائی سوچی اور سمجھوتہ کرنا ہی بہتر جانا، بس اب کیا تھا۔

کچھ دن یونہی گزر گئے۔ پھر میں نے سوچا یہ ایک مُرغا مرغی تو لنڈورے سے لگتے ہیں۔ ایک اور جوڑا خریدنا چاہیئے۔ ہمارے ایک بھائی گاؤں گئے ہوئے تھے۔ انہیں میرے شوق کا حال معلوم تھا۔ اس لئے لوٹتے وقت میرے لئے وہ ایک جوڑا مرغیوں کا لیتے آئے۔ مرغا اونچا پورا، لمبا تڑنگا تھا اور مُرغی بھی موٹی تازی انہیں دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ چلو دو سے چار ہوئے۔ آنگن کی رونق دوبالا ہو گئی مگر لیجئے میرا وہ چین آرام عنقا ہو گیا اچھی، خاصی پرسکون زندگی پہ رقابت کی پرچھائیاں منڈلانے لگیں ابھی تک دو ہی تھے۔ میں تجھ سے خوش تو مجھ سے راضی۔ مگر اب آنگن کی بادشاہی کے دو دعوے دار ہو گئے۔ پہلے والا اپنی قدامت کا رعب جماتا اور نیا مرغا اپنی قوت بازو پر اکڑتا۔ دونوں میں لڑائیاں ہونے لگیں۔ دو دو چونچیں ہر وقت ہوتی رہتیں میں حیران کہ آخر کیا کروں۔ دل کو روؤں کہ جگر کو پیٹوں۔ لاکھ سمجھاتی ہوں پر کوئی مانتا ہی نہیں۔ ایک اکڑ کر [illegible] دیتا ہے تو دوسرا پھیپھڑوں کی پوری قوت صرف کر کے محلے کے اس سرے سے اُس سرے تک خبر کر دیتا ہے کہ دیکھو یہاں ہم بھی ایک [illegible]۔ پتلی گردن موٹی اور چونچیں تیز۔ دو مرغوں میں مُلّا مُردار۔ میں کبھی اسے بہلاؤں کبھی اسے پھسلاؤں۔ بھئی تم دونوں میں سے ایک دل [illegible] آیا ہے، طور طریق کیا جانے تو چھوٹا ہے چپ رہ جا، وہ آپ ہی سمجھ جائے گا۔ اس سے کہتی ہوں کہ بھئی دریا میں رہ کر مگرمچھ

سے بیر کیا. تو بڑا ہے، شفقت کو شیوہ بنا، درگزر سے کام لے۔

ادھر مرغیوں میں بھی جھگڑے ہونے لگے۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ اب دونوں کی جو چشمک شروع ہوئی تو جینا دو بھر ہوگیا۔ ابھی خاصی نند بھاوج کی لڑائی تھی۔ اس کی بات پر وہ ناک بھوں چڑھائے اُس کی بات پر وہ منہ بنائے۔ میں بہتر کہوں کہ بھئی تو پرائی ہے، گھر کی بیٹی ہے، تو ہی غم کھالے۔ جی بڑا کرنے چار روز میں بہو کو آپ ہی سمجھ آجائے گی۔ اس سے لاکھ کہوں کہ بہو تو آخر بہو ٹھہری گھر بار تیرا گھر کی بیٹی سے لاگ ڈانٹ کیسی۔ اس سے اچھا سلوک کرنا، آنچل پھیلا کر دُعا دے گی تو جنم جنم تیری نسل پھیلتی پھولتی رہے گی مگر قسم لے لو جوان کے کان پر جوں بھی رینگے۔ دانا کھلاتے وقت الگ آفت۔ شام کو ڈربے میں بند کرتے وقت الگ مصیبت۔ ادھر سارے گھر والے میرے سر ہوگئے کہ بھئی قصہ ختم کرو اب، چھری پھیر دو گردن پہ۔ پہلے ہی بچوں کا شور کیا کم تھا جو تم نے یہ نئی آفت مول لی کھان بیچتے جاتے ہیں، صحن گندا ہوتا ہے۔ میں اکیلی آخر کس کس کو سمجھاؤں۔ پھر بھی میرا ہی دل گردہ تھا کہ سہے جاتی۔ ساحل لاکھ چھینٹے اڑائے سمندر کا کام بُردباری ہے۔ سب لاکھ جھنجھلائیں میں اپنا کیئے جاتی۔ میرے مرغا مرغی تھے، میں جان دیتی تھی مگر کوئی اور کیوں ان کے نخرے سہتا۔ ہر ایک گالیاں دیتا، کوستا کاٹتا۔ میں سہم جاتی۔ اٹھان اچھی تھی۔ بڑے مُرغ کا تو پانچ سیر وزن ہوگا۔ سارے محلے میں اس کا سا گبرو مشکل سے ملے گا۔ جب دونوں مرغیوں نے پہلے پہل انڈے دیئے تو میں نے سارے گھر والوں میں تقسیم کر دیئے کہ نظر نہ لگے اور اگلی جھول میں اور زیادہ انڈے دیں۔

گھر کے اندر تو میں سو سو جتن کرتی مگر گھر کے باہر تو میرا اختیار نہ تھا۔ اور وہ یہ میرے کہنے میں ایسے تھے کہ پردے بٹھا دیتی۔ مرغ ذات جب تک ادھر اُدھر ٹھونگ نہ مارے پنجہ نہ چلائے چین نہیں پڑتا اتفاق سے کسی دن آنگن کا دروازہ کھلا رہ گیا کسی کو کیا غرض پڑی تھی کہ اس طرف دھیان دیتا۔ ادھر بڑا مُرغا چہل قدمی کو باہر نکلا اُدھر کوئی لفنگا لے اڑا۔ خُدا جانے کب سے نیت بُری تھی جانے قیامت میں کیا منہ دکھائے گا۔ دمڑی کی اوقات، ہوا، اٹھائی گیرا ـــ میں بڑبڑاتی رہی مگر وہ تو چمپت ہوگیا۔ خُدا جانے کاٹ کے کھا گیا یا چوک میں لے جاکر اونے پونے بیچ ڈالا۔ ان گدھوں کو زعفران کی کیا قدر!

گھر میں بھلا کون مجھ سے ہمدردی کرتا۔ لوگوں کو تو ہنسنے کا موقع ہاتھ آگیا۔ کسی کا گھر جلے اور یہ آگ تاپنے پہنچ جائیں۔ دادی اماں نے تو کہہ دیا۔ میں نہ کہتی تھی مرغیاں مت پال، راس نہیں، لے اب چکھ مزا۔ جانے کس مفت خورے کے ہتھے چڑھ گیا۔ کاٹ کر کھا لیتے تو چیز ہوتا۔

میں جلی بھنی بیٹھی تھی۔ اب جو گھر والوں نے فقرہ بازی شروع کی تو ضد آگئی۔ سب چھیڑنے لگے کہ چلو جی کسی گاؤں میں جا کر رہو اور مرغیاں پالو ـــ اتفاق کی بات ہے دوسرے دن منگل تھا۔ میں نے اب کی دفعہ مرغیاں منگوائیں۔ مرغوں کی لڑائیاں چکاتے چکاتے تھک گئی تھی۔ مرغیاں لڑیں گی تو پھر مل جائیں گی۔ لوگ کیا چار چار بیویاں نہیں سنبھال کر رکھتے۔ ہر ایک ہی ڈانٹ ڈپٹ کر رعب جما کر، پیار محبت کا ڈھونگ رچا کر کسی طرح انھیں قابو میں رکھ ہی لے گا۔

ایک مُرغی تو بڑی چست، چالاک، شوخ اور شریر تھی۔ ابھی ادھر ابھی اُدھر، بجلی کی سی تڑپ تھی اس میں۔ دوسری پاؤں پہ بھی تھی اور سفید۔ بڑی سنجیدہ اور احساسِ حُسن سے مغرور بھی۔ ایک پاؤں اُٹھاتی ایک رکھتی، عجب بے نیازی سے ٹہلا کرتی۔

ایسی بے داغ اُجلی کہ بگلا شرما جائے۔ دونوں پل پل دن دن بڑھنے پر پُرزے نکالنے لگیں۔ اب گھر والوں کے منہ میں بھی پانی بھر آیا۔ اندازہ کرنے کہ حلال کی جائے تو کتنا لطف آئے گا۔ ادھر میں ان کی سن سن کر جلی جاتی۔ خدا جانے کیسی کیسی اُنھوں نے دعائیں مانگیں کہ پہلے ہی جھول میں دونوں نے چوزے کا انڈا دیا۔ دادی ماں کہتی ہیں کہ ایسی مرغیاں منحوس ہوتی ہیں، اس لئے فوراً گلے پر چھری پھیر دینی چاہیئے بمفت خوروں کی مُراد بر آئی۔ کسی نے مجھ سے ہمدردی کی بات نہ کہی۔ ایک نے مرغیاں پکڑیں، دوسرے نے چھری تیز کی اور لیجیئے اللہ اکبر۔ مجھ سے دیکھا نہ گیا۔

ابھی ابھی اٹھلاتی پھرتی تھیں، ابھی خاک و خون میں لتھڑی پڑی ہیں۔ ہائے میری نازک مزاج، مغرور شہزادی! ہائے میری البیلی سجیلی، بانکی مہارانی ــــ!!

میں مرغیاں نہیں کھاتی، نہ ان کی بریانی نہ ان کا سالن۔ اس لیئے اوروں نے دکھا دکھا کر خوب مزے لیئے۔ میں نے کھلا کھلا کے خوب موٹا کیا تھا اور وہ لوگ تر مال اڑا رہے تھے، چٹخارے لے رہے تھے۔ کبھی دو دانے نہیں ڈالے تھے اب ہضم کرنا دیکھو۔ ہلدی لگی نہ پھٹکری رنگ چوکھا آیا۔ جب چین سے کھا پی چکے تو میرا شکریہ ادا کرنے آئے۔ جی میں آیا کہ خوب کھری کھری سناؤں مگر یہ سوچ کر چپ ہو رہی کہ مرغیاں تو ہاتھ سے گئیں اب بخشش سمجھ کر ان کو احسان مند کیوں نہ بنا لوں۔ میں نے بھی حاتمی جتائی مگر جی بُرا بُرا ہوتا رہا۔ کئی روز تک کھانا ٹھیک سے کھایا نہ گیا۔ آنگن سونا سونا لگتا تھا۔ اب بھی دو مرغیاں اور ایک مرغ آنگن میں پھرتے ہیں لیکن جو سب کے سب ہوتے تو کتنی رونق ہوتی ــــ اب بھی کوئی نہ کوئی پوچھ لیتا ہے کہ ان تینوں کا گوشت کتنا نکلے گا۔

شرم نہیں آتی انہیں۔ مگر میں کہتی ہوں بکنے دو انہیں۔ اچھا ہوا ان لوگوں کو کھلا دیا ورنہ زہر ہو جاتیں اور یوں بھی گھر کی بلا جانور پر ٹلتی ہے۔ بار بار دل کو سمجھاتی ہوں ــــ سمجھتے سمجھتے سمجھ جائے گا۔

اور لو یاد ہی نہ رہا، کل منگل ہے اگر دو مرغیاں اور منگوا لوں تو ......!

ڈاکٹر زینت ساجدہ

(افسانہ)

سامنے والی عمارت دو منزلہ ہے۔ نیچے اور اُوپر کئی فلیٹ بنے ہیں۔ اُوپر کی منزل کے ایک فلیٹ کی بالکنی کے ایک کونے میں ایک بڈھا اور بڑھیا بیٹھے ہیں۔ صبح، شام جب کبھی نظر اس طرف اٹھتی ہے، وہ دونوں یونہی آمنے سامنے اپنی اپنی کرسی پر بیٹھے دکھائی دیتے ہیں۔ بوڑھے کے ہاتھ میں اخبار ہوتا ہے۔ وہ کبھی اخبار پڑھتا ہے اور کبھی پڑھتے پڑھتے اونگھ جاتا ہے۔ بڑھیا بالکنی کی ریلنگ کے سہارے بیٹھی خالی خالی نظروں سے بستی کو تکے جاتی ہے۔ وہ دیکھتی ہے مگر شاید کچھ نہیں دیکھتی۔ سنتی ہے پر کچھ نہیں سنتی۔ دونوں کی عمر کیا ہے، اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ بڑھاپے کی جس منزل میں وہ ہیں، وہاں سالوں کا حساب اور عمر کا سوال بے معنی ہو جاتا ہے۔ ان کے چہروں کی کیفیت میں یکسانیت اور ٹھیراؤ ہے۔ کبھی ان میں کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا۔ نہ غم نہ خوشی، نہ لاگ نہ لگاؤ۔ کسی جذبے کی ہلکی سی پرچھائیں کا بھی وہاں گزر نہیں۔ یہ چہرے کسی سے کچھ نہیں کہتے۔ وہ دونوں ہماری آپ کی بے حد مصروف پُرشور اور ہنگامہ خیز زندگی کے درمیان رہتے ہوئے بھی ہر چیز سے بے تعلق دکھائی دیتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر کبھی کبھی ایک چھوٹے سے سنسان ٹاپو کا احساس ہوتا ہے جو سمندر کے پھیلے ہوئے طوفانی سینے پر جما ہوا ہے۔ لہریں دندناتی، شور مچاتی اور جھاگ اُڑاتی آتی ہیں اور اس کے کناروں سے سر ٹکرا کر لوٹ جاتی ہیں مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوتا اور نہ اس کی سنسان خاموشی میں کوئی فرق پڑتا ہے۔

اس فلیٹ میں بھی عمارت کے دوسرے فلیٹوں کی طرح دو کمرے ہیں، کچن اور باتھ روم ہے۔ پیچھے اور سامنے برآمدہ ہے ایک طرف آگے کو نکلی ہوئی چھجے دار چھوٹی سی بالکنی ہے۔ فلیٹ کافی آرام دہ ہے، بجلی، پانی، پنکھا، فون ہر چیز موجود ہے۔ دوسرے فلیٹوں میں تنگی کا احساس ہوتا ہے۔ لوگ زیادہ ہیں یا بے ضرورت گھومتے پھرتے ہیں لیکن اس فلیٹ میں وسعت کا احساس ہوتا ہے۔ بوڑھے اور بڑھیا کی دنیا کمروں سے بھی بے تعلق ہے۔ ان کا وجود بس چھوٹی سی بالکنی سے وابستہ ہے۔ کمرے سنسان اور بے کار پڑے رہتے ہیں۔

گھر میں دو نوکر ہیں، ایک عورت اور ایک مرد۔ وہ بھی عام نوکروں سے مختلف ہیں۔ مالک اور مالکن کے ہمزاد لگتے ہیں۔

عورت کمروں میں جھاڑو دیتی ہے، فرش صاف کرتی ہے، کپڑے دھوتی ہے اور برتن مانجھتی ہے۔ مرد بازار جاتا ہے، پھل ترکاری اور ضرورت کی چیزیں خرید لاتا ہے، کھانا پکاتا ہے۔ عورت کام ختم کر کے بستی سے دور اپنے گھر چلی جاتی ہے اور مرد پچھلے برآمدے میں لیٹ جاتا ہے اور بیڑی پیتا ہے۔ گھر کا کام چپ چاپ نمٹ جاتا ہے۔ ہر کام وقت پر ہو جاتا ہے۔ نہ بک بک نہ جھک جھک، عام گھروں کی طرح نوکروں کے پیچھے نہ کوئی سر کھپاتا ہے نہ انہیں بار بار آواز دیتا ہے۔

بالکنی میں کرسیوں کے پاس ایک چھوٹی سی میز رکھی ہوئی ہے۔ اس پر دواؤں کی بوتلیں، پانی کا گلاس، جگ، پھلوں کی پلیٹ اور بسکٹوں کا ڈبہ دھرا ہے۔ ایک کونے میں ریڈیو رکھا ہے دونوں شاید اونچا سنتے ہیں۔ اس لئے جب بھی ریڈیو بجتا ہے تو آواز بہت اونچی ہوتی ہے۔ سارا محلہ انہیں کے ریڈیو سے خبریں سنتا ہے۔ کرکٹ کے سیزن میں کمنٹری سنی جاتی ہے۔ ریڈیو ان کے لئے بولتا ہوا اخبار ہے۔ گانے اور دوسرے پروگرام سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ سامنے کی دیوار پر ایک بڑی گھڑی لٹکی ہوئی ہے۔ جس کا پنڈولم جھولتا رہتا ہے اور ہر آدھے گھنٹے وقت کا اعلان کرتا ہے ــــ ٹن، ٹن، ٹن،۔

جاڑا ہو یا گرمی دونوں بالکنی میں سارا دن گزار دیتے ہیں۔ رات بہت دیر گئے جب ساری بستی سو جاتی ہے، وہ سونے کے لئے اندر کمروں میں جاتے ہیں اور صبح سویرے سب کے جاگنے سے پہلے پھر وہاں موجود ہوتے ہیں۔ ان کے لئے ایک دن اور دوسرے دن میں کوئی فرق نہیں۔ ہاں جاڑا ہو تو بڑھیا شال اوڑھے لپیٹے رہتی ہے اور بوڑھا گرم کوٹ پہنے دکھائی دیتا ہے۔ گرمی میں صبح سے رات دیر گئے تک پنکھا چلتا رہتا ہے۔

اس عمارت اور آس پاس کی عمارتوں کے فلیٹوں میں ہر طرح کے لوگ آباد ہیں۔ لیکن ہر بڑے شہر کی طرح یہ نئی بستیاں محلہ نہیں بن پاتیں۔ یہ ادارہ ہیں محلہ نہیں۔ ان کا اپنا چہرہ نہیں، شخصیت نہیں، انفرادی وجود نہیں۔ پرانے محلوں کی طرح یہاں ایک گھر کا دوسرے گھر سے کوئی تعلق نہیں۔ یہاں ہر فلیٹ ایک اکائی ہے، بے نام اکائی۔ ــــ یہاں لوگ ــــ جوان، بوڑھے، بچے، مرد اور عورتیں ــــ اپنے فلیٹ کی چار دیواری میں محصور ہیں، پڑوس ہے لیکن کوئی پڑوسی نہیں۔

ہر فلیٹ کی اپنی دنیا ہے لیکن ہر جگہ چہل پہل ہے، ہمہ ہمی ہے۔ زندگی ہے، کہیں شور و غل ہے کہیں بچوں کے قہقہے ہیں، کہیں ڈانٹ پھٹکار ہے، کہیں شکوے شکایتیں ہیں۔ غرض وہ سب کچھ ہے جو عام گھروں میں دن رات ہوتا رہتا ہے، لیکن ان کی صبح و شام یکساں نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف بوڑھے اور بڑھیا کے فلیٹ میں زندگی ایک حال پر قائم ہے۔ یہاں وقت رک سا گیا ہے۔ ایک ہی دن بار بار آتا ہے اور گزر جاتا ہے، گزرتا بھی نہیں گزارا جاتا ہے۔ باہر لمحے گھڑیوں میں، گھڑیاں دنوں میں اور دن برسوں میں بدلتے جاتے ہیں لیکن یہاں ایک ہی لمحہ بار بار تکرار کر رہا ہے برسوں سے، صدیوں سے، جانے کب سے۔ فلیٹ سے باہر، دوسرے فلیٹوں میں یا گلی اور بازار میں جو کچھ ہوتا ہے اس سے اس فلیٹ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

گلی میں سویرے میونسپلٹی کے لوگ جھاڑو لگاتے ہیں، پھر دودھ والے کی آواز سنائی دیتی ہے، اخبار بیچنے والے لڑکے چیخ چیخ کر اخبار بیچتے ہیں، سڑک پر بسیں اور کاریں دوڑتی ہیں۔ رکشہ والوں کی گھنٹیاں بجتی ہیں۔ ہر گھر سے مختلف قد و قامت کے نیچے اونچے بچیاں، کندھوں سے بستے لٹکائے شور مچاتے نکلتے ہیں۔ یا سب ایک ساتھ باتیں کرنے لگتے ہیں۔ دفتروں میں کام کرنے

والے مرد اور عورتیں ہاتھوں میں بیگ لئے ٹفن سنبھالے تیز تیز قدم اٹھاتے سڑک کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ ہر گھر سے کپڑے دھونے اور نوکروں کو پکارنے کی آوازیں آتی ہیں۔ ـــــ پھر ٹھیلے پر سامان بیچنے والوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ عورتیں اپنے اپنے دروازے پر کھڑی سامان خریدتی ہیں، دام چکاتی ہیں، پھٹکارتی ہیں ـــــ پھر کچھ دیر کے لئے سناٹا چھا جاتا ہے، عورتیں بھی چُپ ہیں۔ زندگی چاروں طرف اونگھ رہی ہے۔ دوپہر ڈھلنے لگتی ہے تو برتن بیچنے والوں، کپڑا بیچنے والوں، پھیری والوں کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ فلیٹ جاگ اُٹھتے ہیں۔ گھروں کی صفائی ہوتی ہے، عورتیں ایک دوسرے کو پکارتی ہیں، چھوٹے بچوں کے رونے کی آوازیں آتی ہیں، مائیں ڈانٹ ڈپٹ کر انہیں چُپ کراتی ہیں۔ پھر چار بجتے ہیں۔ سڑک پر گاڑیوں کا شور بڑھنے لگتا ہے۔ مونگ پھلی والا اپنا ٹھیلہ گلی کے نکڑ پر کھڑا کر دیتا ہے۔ بچے اسکول سے نیچے لوٹ رہے ہیں۔ مونگ پھلی اور میٹھی گولیاں خرید رہے ہیں۔

آئس فروٹ اور کھلونے والوں کی آوازیں بلند ہوتی ہیں اور بچے ادھر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ چھینا جھپٹی کرتے ہیں، اپنی کتابیں ایک طرف کو پھینک کر ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے لگتے ہیں۔ مائیں چلا چلا کر انہیں چُپ کراتی ہیں، بیچ بچاؤ کرتی ہیں، ناشتہ کو بلاتی ہیں، مار پیٹ کرتی ہیں۔ بچے کچھ دیر کو ماؤں کے ساتھ گھروں میں چلے جاتے ہیں لیکن پھر شور مچاتے باہر نکل آتے ہیں کہیں گولیاں کھیل رہے ہیں، کہیں لٹو گھما رہے ہیں اور کہیں گلی ڈنڈا۔ پتنگوں کے موسم میں ہر ایک کے ہاتھ میں پتنگ اور چرخ ہے۔ ہوا میں پتنگیں ڈول رہی ہیں، رنگ برنگی، چھوٹی بڑی۔ پتنگ کٹتی ہے تو لوٹنے کے لئے دوڑ پڑتے ہیں، ایک دوسرے سے گتھ جاتے ہیں، دھینگا مشتی ہوتی ہے، تو تو میں میں ہوتی ہے کالج کے طالب علم کتابیں گھروں میں پھینک کر اپنے اپنے لباس کی سج دھج دکھانے کے لئے سڑکوں پر نکل آتے ہیں۔ گلی کے نکڑ پر دو دو چار چار کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔ قہقہے لگا رہے ہیں، فقرے چست کر رہے ہیں، لڑکیوں پر آوازیں کس رہے ہیں، خوش فعلیاں کر رہے ہیں۔

دفتروں میں کام کرنے والے تھکے ہارے ڈھیلے ڈھالے قدم رکھتے گھروں کی طرف لوٹ رہے ہیں، منہ لٹکا ہوا ہے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی آرام کرسی میں ڈھیر ہو جاتے ہیں یا اپنی بیویوں پر غصہ اُتارنے لگتے ہیں۔

شام ہوتے ہی ہر فلیٹ میں شور بڑھ جاتا ہے۔ کھانا پکانے کا شور، بچوں کے کھانے اور کھلانے کا ہنگامہ، طالب علموں کا چلا چلا کر سبق یاد کرنا، چھوٹے بچوں کا رونا، ریڈیو کا شور ـــ ہر فلیٹ کی ساری بتیاں روشن ہیں۔ پھر ایک ایک کر کے بتیاں بجھنے لگتی ہیں۔ دھیرے دھیرے سناٹا چھا جاتا ہے اور اندھیرے کی چادر ساری بستی پر پھیل جاتی ہے۔

یہ سب آوازیں، یہ ساری چہل پہل، یہ شور یہ ہنگامہ اس فلیٹ کے چاروں طرف دن بھر گھومتا رہتا ہے مگر فلیٹ میں داخلہ کا راستہ اسے نہیں ملتا بلکہ سناٹا یہیں سے نکل کر ساری بستی پر چھا جاتا ہے۔ بوڑھا اور بڑھیا وقت کے ان ہنگاموں کو سناٹے میں بدلتا دیکھتے ہیں۔ انھیں ان ہنگاموں سے کوئی سروکار نہیں، وہ خود سناٹا ہیں۔ انھیں کہیں جانا نہ آنا۔ گھر میں کوئی بچہ نہیں جو روئے اور اسے چُپ کرانے کے لئے لوری گائی جائے یا کہانی سنائی جائے۔ کوئی نوجوان نہیں، جس کو دیر گئے گھر لوٹنے پر تنبیہہ کی جائے۔ نہ بہو ہے، جس سے جھگڑا ہو۔ نہ بیٹی ہے، جس سے سر میں تیل لگوایا جائے ـــــ کوئی نہیں ـــــ کوئی نہیں ـــــ بس وہ دو نوں ہیں۔ انھیں آپس میں کچھ کہنا سننا بھی نہیں۔ کوئی

موضوع نہیں، کوئی مسئلہ نہیں۔ سب باتیں کی جاچکی ہیں۔ تمام موضوع ختم ہوچکے ہیں۔

ان کے نام کیا ہیں؟ شاید وہ خود بھی اپنے نام بھول چکے ہوں۔ وہ بے آواز اور بے جان مورتیاں معلوم ہوتے اگر ہر پندرہ منٹ یا آدھ گھنٹے کے بعد ان کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ یہ آواز بھی شاید اس لئے اونچی ہوتی ہے کہ ایک دوسرے کو اپنے وجود کا احساس دلائیں۔

صبح مرغ اذاں بھی نہیں دیتا کہ فلیٹ میں بوڑھے کی آواز گونجتی ہے، اوہ کیا وقت ہوگا، اور بڑھیا شاید بڑی گھڑی دیکھتی اور وقت بتاتی ہے، ابھی چار بجے ہیں۔ اچھا، اچھا ــــــ بستی میں جھاڑو لگانے والوں کی آواز آتی ہے اور بوڑھا پوچھتا ہے، کیا وقت ہوگا؟ بڑھیا کہتی ہے، چھ بج گئے ہیں، چائے آگئی ہے، پی لو۔ اخبار یہ رکھا ہے ــــــ وقت گزر رہا ہے جنجھلا کر بوڑھا انگڑائی لیتا ہے، کیا وقت ہے، کیا وقت ہوگا؟ بڑھیا کہتی ہے، ساڑھے سات بجے ہیں ناشتہ کرلیں ــــــ کیا وقت ہوگا؟ آٹھ بجے ہیں، ریڈیو سن لیں ــــــ کیا وقت ہوگا؟ ۹ بجے ہیں دوائی کھالیں ــــــ کیا وقت ہوگا؟ گیارہ بجے ہیں، رس پی لیں ــــــ کیا وقت ہوگا؟ بارہ بجے ہیں، کھانا کھالیں ــــــ کیا وقت ہوگا؟ دو بجے ہیں آرام کرلیں۔ کیا وقت ہوگا؟ چار بجے ہیں، چائے پی لیں ــــــ کیا وقت ہوگا؟ چھ بجے ہیں دوائی کھالیں ــــــ کیا وقت ہوگا؟ آٹھ بجے ہیں کھانا کھالیں ــــــ کیا وقت ہوگا؟ نو بجے ہیں، خبریں سن لیں ــــــ کیا وقت ہوگا؟ کیا وقت ہوگا؟ کیا وقت ہوگا؟

بوڑھے کی آواز گھنگھلی اور بھاری ہے، بڑھیا کی آواز سپاٹ ہے۔ بوڑھا صرف کیا وقت ہے کی گردان کرتا رہتا ہے۔ بڑھیا وقت اور پروگرام بتاتی جاتی ہے۔ ہر گھڑی کا کام بندھا ٹکا ہے۔ وہ اس کا اعلان کرتی رہتی ہے۔ نہ پوچھنے کا انداز بدلتا ہے اور نہ جواب دینے کا ڈھنگ ــــــ مقررہ وقت پر وہی سوال اور اس کا وہی مقررہ جواب ــــــ گھڑی کی سوئی گھومتی رہتی ہے، سکنڈ منٹ میں، منٹ گھنٹوں میں، گھنٹے دن رات میں اور دن رات ہفتوں اور مہینوں میں بدلتے رہتے ہیں لیکن ان کے لئے وقت وہی ہے جو تھا۔

بوڑھے کو پنشن ملتی ہے۔ پہلے وہ ایک بڑے مکان میں رہتے تھے، جس میں کئی کمرے دالان، برآمدے اور صحن تھے۔ بیٹوں کے مستقبل کی تلاش میں بیرون ملک جانے کے بعد، جب تک طاقت تھی وہ اسی مکان میں رہا کئے۔ ان دنوں بوڑھا وقت گزاری کے لئے باغیچے میں صبح شام کھرپی لئے کام کرتا تھا اور بڑھیا سلائی، بنائی اور پکوان سے جی بہلایا کرتی تھی۔ دونوں پابندی کے ساتھ ٹہلنے جایا کرتے تھے لیکن تاب دتواں جواب دے چکے تو ڈھنڈار سے گھر سے وحشت ہونے لگی۔ انہوں نے مکان کرایہ پر اٹھادیا اور اس فلیٹ میں اٹھ آئے۔ پنشن اور مکان کے کرایہ سے ان کی گزر بسر بڑے آرام کے ساتھ ہوجاتی ہے۔

دونوں لڑکے باہر کے ملکوں میں خوب کماتے ہیں اور خوب خرچ کرتے ہیں مگر مصروف ہیں، بے حد مصروف اس لئے ماں باپ کے ہاں آسکتے ہیں اور نہ انھیں بلا سکتے ہیں۔ ہر مہینہ اپنی خیریت کا خط بھیج دیتے ہیں۔ اس خط سے ان کے درمیان رشتہ قائم ہے۔ ڈاکیہ مہینے میں ایک دو چکر اس گھر کے بھی لگا جاتا ہے اور دو خط، بجلی کا بل، کرایہ دار کا چیک پہونچایا جاتا ہے۔ دودھ والا اور روٹی والا ہر مہینے مقررہ دن آکر حساب لے جاتا ہے۔ اس میں کبھی کمی بیشی نہیں ہوتی۔

ہر ہفتے ڈاکٹر آتا ہے۔ نبض، دل اور خون کا دباؤ چیک کرتا ہے اور وہی دوائیں لکھ جاتا ہے جو وہ مہینوں اور برسوں سے کھا رہے ہیں ـــــ کسی چیز میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، کوئی فرق نہیں آتا۔ ہر چیز وہی ہے، ہر چیز دہرائی جا رہی ہے مگر گزرتے وقت کی چپ چاپ مشین انہیں دھیرے دھیرے گھس رہی ہے۔ تنہائی انہیں دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے، کھوکھلا کر رہی ہے۔

کیا وقت ہے ؟

کیا وقت ہوگا ؟

یہ وقت آخر کب گزرے گا، کب گزرے گا ـــــ !

حیدرآباد صدیوں سے تہذیب، کلچر، ادب اور ثقافت کا پاسدار رہا ہے۔ قطب شاہیوں سے آصف جاہی حکمرانوں تک ادبی تہذیبی تمہوروں میں اردو کے اہم ادبی مرکز نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ حیدرآباد فرخندہ بنیاد کھلا تارہا ہے اور ابتدا ادبی سے اہالیوں کا یہ شہر آرزو اردو بنیاد بن رہا ہے [illegible] کی خدمات، جامعہ عثمانیہ کا قیام، دارالترجمہ کی تشکیل، دکنیات پر تحقیق و تنقید حیدرآباد کے روشن کارنامے ہیں۔ قومی یگانگت اور ہم آہنگی حیدرآباد کی ...

روح دکن کے ذرّہ ذرّہ سے عبارت ہے۔ حیدرآباد لسانی ہم آہنگی اور خیر سگالی کی عظیم اقدار کا گہوارہ ہے۔ حیدرآباد محمد قلی، وجہی، غواصی، فیض، شاد، امجد، زور اور مخدوم کا خیابانِ آرزو ہے جہاں آج بھی فکر و فن، علم و ادب، تحقیق و تنقید کی جوئے شیر رواں ہے۔ یہاں کا شعری ماحول، علمی اور تخلیقی شعور برصغیر کے لیے مثال بنا ہوا ہے۔ اسی ماحول نے سروجنی نائیڈو بلبل ہند کے شہر سخن کی بیٹی، جامعہ عثمانیہ کی دیدہ ور محقق، صاحبِ طرز انشاء پرداز، جادو بیاں مقرر ڈاکٹر زینت ساجدہ کو جنم دیا۔

ڈاکٹر زینت ساجدہ کے بارے میں ممتاز ادیب ڈاکٹر مجاور حسین رضوی، ریڈر شعبۂ اردو حیدرآباد یونیورسٹی نے ایک جلسۂ تہنیت میں کہا تھا۔ "ڈاکٹر زینت ساجدہ محقق بھی ہیں، نقاد بھی، مورخ بھی، مترجم اور

وقار خلیل:-

جشنِ زینت ساجدہ کا آنکھوں دیکھا حال

و افتتاحی اجلاس و شامِ غزل و سمینار اور مشاعرہ

تخلیق کار بھی ہیں۔ بحیثیت استاد اردو وہ صرف کام دیکھتی ہیں تعصبات، تعینات اور تحفظات کی دیواریں گرا کر روشنی کسی مخصوص درسگاہ یا علاقہ میں محدود نہیں کی جاسکتی اور وہ روشنی کے اس مقدس ورثے کو اپنے شاگردوں میں فیاضی کے ساتھ تقسیم کرنے کے ہنر سے آشنا ہیں، ان کے فیوض و برکات کا سلسلہ دراصل گنگ و جمن تک روشن ہے۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ میں نہ مذہبی تعصب ہے نہ لسانی تنگ نظری، میری دعا ہے کہ جب تک گنگا جمنا بہتی رہیں، جب تک چارمینار ہاتھ اٹھائے مصروفِ دعا ہے تب تک ڈاکٹر زینت ساجدہ کی شفقتوں کا نور اسی طرح نور افشانی کرتا رہے۔" یہ آواز صرف ڈاکٹر مجاور حسین کی آواز نہیں، اس آواز میں اہلِ حیدرآباد کا دل دھڑک رہا ہے۔ انھیں دھڑکتے دلوں کے ساتھ اہلِ حیدرآباد نے اپنے محبوب ادیب اور شفیق استاد کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے ۹ اور ۱۰ جون کو جشن برپا کیا تھا۔ جس کی ہماہمی اور رونق، جس کی رنگارنگی اور آراستگی، جس میں شریک ہونے والوں کی عقیدت، محبت اور وارفتگی اور جس میں حصہ لینے والوں کے بے لوث خراجِ عقیدت سے متاثر ہو کر بزرگ محقق پروفیسر نذیر احمد نے کہا تھا: "آج کے دور میں جبکہ استاد اور شاگرد کے درمیان فاصلے بہت بڑھ گئے ہیں اور شاگرد سلام تک کے روادار نہیں ہوتے۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ کے شاگردوں اور ارادت مندوں کا اس شاندار پیمانے پر جشن کا منعقد کرنا، ہمعصروں کا کھلے دل سے خراجِ عقیدت

پیش کرنا اور اتنی بڑی تعداد میں مختلف زبانوں کے ادیبوں، دانشوروں، شاعروں اور عام لوگوں کا جمع ہونا بہت بڑی بات ہے۔ ادیب اور استاد کی حیثیت سے ڈاکٹر زینت ساجدہ کی اس غیر معمولی مقبولیت سے نہایت خوشی ہوئی، اس سعادت بزور بازو نیست، زندگی کی یہ سب سے بڑی کامیابی ہے زندگی خواہ ادبی و علمی ہو یا سیاسی ہے۔

۱۲ جون ۱۹۸۱ء کی خوشگوار اور دل نواز شام اپنے جلو میں ایک سیلاب نکہت و نور اور موج نشاط و سرور لیئے آئی۔ اردو ہال کا آڈیٹوریم چنبیلی اور گلاب، موتیا اور موگرہ کے پھولوں اور برقی قمقموں سے نشاطی منظر پیش کر رہا تھا۔ کاروں، اسکوٹروں اور سیکلوں پر زینت شناس اصحاب و خواتین مینہ کی بوندوں کے جانفزا سلسلے کی طرح آتے رہے اور اپنی اپنی نشستوں پر براجمان ہوتے رہے۔ زینت آپا کی علمیت، ان کے بے پناہ خلوص اور ان کی حیدرآبادیت کی موہنی پر رطب اللسان، محو گفتگو، سلام و دعا خیریت اور خوش آمدید کے کلمات سے لوگ ایک دوسرے کی پذیرائی کر رہے تھے جیسے ان میں سے ہر ایک میزبان ہو۔ وسیع و عریض اردو ہال اپنی تنگ دامنی پر گلہ گذار تھا اور زینت آپا کے چاہنے والوں کا نہ رکنے والا سلسلہ اختتام اجلاس تک جاری رہا۔ بزرگ، خواتین، نوجوان، ادب، تہذیب، سیاست اور ثقافت کے آسمان پر جگمگانے والی شخصیتوں، جامعہ عثمانیہ کے قدیم و زیر تعلیم طلباء، شاعروں، مصنفوں، افسانہ نویسوں اور تلگو، مرہٹی، کنڑی اور انگریزی ادبیات کے دانشوروں کی آمد آمد تھی۔ ساڑھے چھ بجے شام جلسہ کی کارروائی جناب میر احمد علی خاں نے شروع کی۔ اردو ہال کے شہ نشین پر جو دلہن کی طرح سجا ہوا تھا، بزرگ اردو رہنما پروفیسر حبیب الرحمٰن کرسی صدارت پر تشریف فرما تھے، بحیثیت مہمان خصوصی شمالی ہند میں دکنیات کے نامور محقق پروفیسر نذیر احمد سابق صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور مہاراشٹرا کے مورخ اردو دکنیات کے عالم جناب دیوی سنگھ چوہان اور باغ و بہار شخصیت کی مالک صاحب جشن زینت ساجدہ رونق محفل تھیں۔ مولوی حبیب الرحمٰن معتمد عمومی ریاستی انجمن ترقی اردو نے ڈاکٹر زینت کو بزرگانہ شفقتوں کے ساتھ ریشمی شال نذر کی۔ زینت شناس اصحاب و خواتین اور علمی و ادبی، تہذیبی و ثقافتی اداروں کے سربراہوں نے مسرت و عقیدت کے جذبات کے ساتھ زینت آپا کی بکثرت گلپوشی کی جن میں جشن زینت ساجدہ کمیٹی کے سکریٹری ڈاکٹر رشید موسوی، زندہ دلان حیدرآباد، اردو ادارہ عثمانیہ کالج کی بزم اردو، اقبال اکیڈیمی، انجمن طلبائے قدیم اردو آرٹس کالج، نظام کالج، فائن آرٹس اکیڈیمی، اردو ماڈل اسکول انجمن ترقی اردو شہر حیدرآباد قابل ذکر ہیں ان کے علاوہ زینت آپا کے پیراستے اور نئے شاگردوں اور رشید اینوں کی بہت بڑی تعداد بھی پھول پہنانے والوں میں شامل تھی۔ اس موقع پر تالیوں کی گونج میں جشن کمیٹی کی طرف سے ڈاکٹر زینت ساجدہ کی خدمت میں گیارہ ہزار ایک سو ایک روپے کا کیسہ زر بہ وساطت پروفیسر حبیب الرحمٰن، زینت آپا کی صاحبزادی آمنہ شاہد کو پیش کیا گیا۔

ممتاز قانون داں جناب منوہر راج سکسینہ صدر انجمن ترقی اردو شہر حیدرآباد نے اس موقع پر موصولہ پیامات تہنیت سنائے۔ نامور ترقی پسند نقاد ڈاکٹر محمد حسن، ممتاز محقق رشید حسن خاں، ڈاکٹر وحید اختر اور پاکستان کے دانشور ڈاکٹر جمیل جالبی کے علاوہ پروفیسر شبیہ الحسن لکھنؤ یونیورسٹی نے ڈاکٹر زینت ساجدہ کے اس جشن میں تمام ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے تہنیتی تاثرات کا اظہار کیا تھا۔

ممتاز افسانہ نگار ادیب جناب عاتق شاہ لکچرر شعبۂ اردو سردار پٹیل کالج نے "ایک آواز ایک تاثر" کے زیر عنوان خاکہ سنایا کہ "ایک آواز جس نے تدریس کے پیشے کی آبرو رکھی اور کتنے ہی شاگردوں کو شعر و ادب کے رموز سکھائے، جس کا نام زینت ساجدہ ہے ایک بھرپور اور ہمہ گیر شخصیت ہے، خود دم کے بعد حیدرآباد کے علمی و ادبی احوال میں وہی تو روشن تر نظر آتی ہیں جن سے ملنے کے بعد شرافت کا مفہوم ظاہر ہوتا ہے اور کتابوں کے بعد زندگی کے معنی کھلتے ہیں اور راز کی طرح منکشف ہوتی ہیں۔ حیدرآباد کے ادبی ماحول کی بصیرت و بصارت

سے زینت آپا کی شخصیت عبارت ہے وہ ایک ذمہ دار خاتون ہی نہیں اچھی استانی اور صاحب طرز قلمکار بھی ہیں ۔ عاتق شاہ کے خاکے ڈھنگ رنگ روشن کر دیئے ہیں جسٹس گوپال راؤ ایکبوٹے سابق جسٹس آندھرا پردیش ہائیکورٹ وصدر نیشنل ہارمنی اسٹوڈیو نے افتتاحی اجلاس سے خطاب کیا اور کہا کہ " زینت ساجدہ دکن کے ادبی اُفق پر اپنی بے پناہ تخلیقی ، تنقیدی اور تحقیقی صلاحیتوں کی تابناکی اور سماجی بصیرت کی روشنی کے ساتھ طلوع ہوئیں اور آگہی کے نور کو عام کیا ۔ وہ جس اُردو میں بولتی اور لکھتی ہیں ، اس کی سلاست اور شیرینی سے ہزاروں اثر قبول کرتے ہیں ۔ جسٹس ایکبوٹے نے اس موقع پر اُردو والوں کو مخلصانہ مشورہ دیا کہ وہ دیہات میں رہنے والوں تک زینت ساجدہ کی آسان سادہ زبان کو پہنچا کر اُردو کے دائرے کو وسیع سے وسیع کریں ۔ آپ نے آچاریہ ونوبا بھاوے کا یہ قول دہرایا کہ اچھا ادب کا معیاری استاد وہ ہوتا ہے جس کا کسی محدود سیاسی تنظیم سے تعلق نہ ہو ، وہ بے خوف اور صاف گو ہو ، کوئی اس کا مخالف یا حریف نہ ہو " اس قول کی روشنی میں ڈاکٹر زینت ساجدہ پوری اُترتی ہیں اور وہ دبستانِ دکن کی کامیاب استاد قرار پاتی ہیں ۔ انھوں نے زینت ساجدہ کی جادو بیانی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ یوں تو میں نے ان کو مختلف ادبی موضوعات پر بولتے سنا ہے لیکن پریم چند صدی تقاریب میں اُردو ، ہندی اور مراٹھی اداروں کی جانب سے منعقد ہونے والے جلسوں میں انھوں نے جو تقریریں کیں ان کو فراموش نہیں کر سکتا ۔ انھوں نے اپنے آپ کو کبھی نہیں دہرایا اور ہر وقت ایک نئے موضوع پر اظہار خیال کیا ۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ پریم چند کا انھوں نے بڑا گہرا مطالعہ کیا ہے ۔ ہندوستانی ادبیات پر ہی نہیں عالمی ادب پر بھی ان کی گہری نظر ہے ۔ وہ جزئیات سے بڑے گہرے معنیٰ پیدا کرتی ، وہ مصنف کی روح کے قریب پہنچ جاتی ہیں ۔ ان کا اپروچ اوریجنل ہوتا ہے (اُردو ہال اس جملے پر دیر تک تالیوں سے گونجتا رہا) جسٹس ایکبوٹے نے اُردو کے کل ہند کلچر کو زبردست خراج ادا کرتے ہوئے اس دعا پر اپنی تقریر ختم کی کہ ڈاکٹر زینت ساجدہ اسی انہماک اور صحت کے ساتھ اُردو زبان اور اُردو ادب کی خدمت کرتی رہیں !

آئی کرشنا موہن سکریٹری آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈیمی نے اکاڈمی کی طرف سے ڈاکٹر زینت کے جشن پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ ہم استادوں کی بھی استاد ہیں " آپ نے تلگو ، ہندی اور فارسی ادبیات میں ڈاکٹر زینت ساجدہ کی علمیت کو زبردست خراجِ تحسین ادا کیا ۔ اور کہا کہ انھوں نے تلگو ادب کی تاریخ لکھ کر تلگو ادب اور اس کی روایات سے اُردو والوں کو واقف کرایا اور تلگو کی بڑی خدمت انجام دی ۔ یہ کتاب ان کا بڑا کارنامہ سمجھی جائے گی ۔

ہندی کے نامور دکنی محقق پروفیسر سری رام شرما نے اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ جب میں دکنی بول چال پر تحقیق کر رہا تھا تو زینت ساجدہ نے میری رہنمائی کی ۔ دکنیت ان کی شخصیت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے ۔ وہ دم گفتگو اپنی جادو بیانی اور شیرینی کے باعث موہنی لگتی ہیں ۔ ان کی پہلو دار شخصیت اور تدریسی وعلمی صلاحیتوں کا فیض اساتذہ اور طلبا پر یکساں رہا ہے ۔ ڈاکٹر ساجدہ دکن کی پانچ سو سالہ حب الوطنی کی روایات کی امانت دار ہیں ۔ قاضی محمود بحری کے خانوادہ کی علمی ، صوفیانہ اور شریفانہ روایت اور اقدار کو زینت آپا نے اپنا ادبی مسلک بنائے رکھا ہے ، ان کی مقناطیسی شخصیت میں شیخ ، سید اور پٹھان کے روپ خوب روشن نظر آتے ہیں ۔ ڈاکٹر شرما نے بڑے ہی خلوص دل سے زینت آپا کی علمی ادبی خدمات کو خراجِ عقیدت ادا کیا ۔ اور ان کی تصانیف حیدرآباد کے ادیب اور کلیات شاہی پر سیر حاصل تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ان سے ان کے علمی تبحر اور تحقیقی صلاحیتوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے ممتاز اور ترقی پسند سیاسی رہنما ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے " بھرے گھر کی بہو " کے زیر عنوان خوبصورت

انشائیہ سناکر داد و تحسین پائی۔ انھوں نے کہا کہ ہم سب ایک رہنمائے مرد خاتون کا جشن منانے جمع ہوئے ہیں، شاگردوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے میں وہ کسی منصوبہ کی کبھی قائل نہیں رہیں۔ ان کے شاگرد حیدرآباد ہی میں نہیں حیدرآباد کے باہر بلکہ بیرون ملک بھی پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ سچی استانی اور ممتا سے معطر ماں ہیں ظاہرداری اور مصلحتوں کی قائل نہیں۔ وہ ہندوستان کی ان چند خواتین میں سے ہیں جن کی حق گوئی اور بے باکی کا جواب نہیں جس کی وجہ سے اگر کچھ لوگ ان سے ناراض رہتے ہیں تو اکثر اسی بنیاد پر انھیں ٹوٹ کر چاہتے ہیں

بزرگ محقق اور عالم پروفیسر نذیر احمد نے اس موقع پر دکنی ادب میں ڈاکٹر زینت ساجدہ کی محققانہ بصارت اور ان کی عالمانہ تحقیق دروں بینی کو خراج تحسین ادا کیا۔ اشرف کی مثنوی "نوسرہار" کی ترتیب و تدوین اور متنی تحقیق پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر احمد نے ڈاکٹر زینت ساجدہ کی اس تحقیق کو مثالی اور فاضلانہ دکنی کارنامہ قرار دیا اور کہا کہ اس مقالے کے ہر باب پر پی ایچ ڈی کی ڈگری کی دی جاسکتی تھی۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے کہا کہ اس سے اچھا مقالہ انھوں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ یہ مقالہ چھپ جائے تو آنے والے محققوں کے لیے رہنمائی کا سبب بنے گا اور اردو لغت لسانیات اور قواعد پہ کام کرنے والوں کے لئے نئی راہیں کھل جائیں گی۔

صدر جلسہ پروفیسر حبیب الرحمٰن نے استاد اور شاگرد کے مقدس رشتوں کا ذکر کرتے ہوئے جشن زینت کے اہتمام میں ان کے شاگردوں نے جس سعادت مندی کا مظاہرہ کیا اس پر مبارکباد پیش کی اور آج کے تدریسی ماحول کے تجارتی انداز اور مصنوعی پن پر افسوس کا اظہار کیا۔ صاحب جشن ڈاکٹر زینت ساجدہ نے اظہار تشکر کے کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ "محبت آشنا دل ہی محبت کو پہچانتا ہے" یہ خوش بختی کی بات ہے کہ میرے شہر کے لوگ مجھے اس قدر چاہتے ہیں۔ میں اپنے شاگردوں اور کرم فرماؤں کی اس چاہت کو اپنی زندگی کا سرمایہ سمجھوں گی۔

ڈاکٹر زینت ساجدہ نے مزید کہا کہ پڑھانا اور پڑھنا میری زندگی ہے۔ علم کی یہ دولت مجھے آباو اجداد سے ورثے میں ملی ہے جسے فرض جان کر میں اپنے شاگردوں میں بانٹتے ہوئے سکون اور مسرت محسوس کرتی ہوں ماحول اور زمانے سے میرا رشتہ ہمیشہ استوار رہا ہے۔ میری ۳۲ سالہ تدریسی اور علمی خدمات کا میرے شیدائیوں اور میرے شاگردوں نے جس محبت کے ساتھ اعتراف کیا ہے اس پر مجھے فخر رہے گا۔

جشن زینت ساجدہ کے افتتاحی اجلاس کے بعد شب غزل کا پروگرام مختصر وقفہ کے بعد شروع ہوا اور رات دیر گئے تک پدم شری عزیز احمد خاں وارثی، رکن الدین، حبیب علوی، مسرت خان، اطہر، شکیل اور رام دیو نے دکن کے نامور شعراء کا کلام خوبصورت اور شیریں وصنوں میں پیش کر کے جشن کی رات کو یادگار بنایا۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ مہمان خصوصی تھے۔ جناب اسلم فرشوری نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

جشن زینت ساجدہ کے سلسلے میں ۷ رجون کو ساڑھے دس بجے صبح اردو ہال میں "دکنی تحقیق، سمت اور رفتار" کے موضوع پر سیمینار دکن کے نامور محقق اور نقاد ڈاکٹر حفیظ قتیل سابق ریڈر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ابتداً ڈاکٹر حبیب ضیاء لیکچرر اردو، اورینٹل کالج نے "دکنی تحقیق میں ڈاکٹر زینت ساجدہ کا حصہ" کے موضوع پر مبسوط اور متوازن مقالہ پیش کیا اور ڈاکٹر ساجدہ کی مرتبہ دکنیات کی دو کتابوں کلیات علی

عادل شاہی اور اشرف کی مثنوی " نوسرہار " کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے ان کی علمیت، تحقیقی دوربینی اور دکنی ادبیات سے دیرینہ لگاؤ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ زینت آپا بیک وقت افسانہ، تنقید، انشائیہ مزاح اور تحقیق کے میدانوں میں اپنی طبع رسائی کی جولانیاں دکھلاتی رہی ہیں ۔ وہ صاحب طرز انشا پرداز، دیدہ ور محقق ہیں اور تحقیق کی معمولی جزئیات پر ان کی دوررس نظر اس امر کی گواہی دیتی ہے کہ وہ اس باب میں متنی تحقیق کے جدید اصولوں پر خاص نظر رکھتی ہیں ۔ اس سیمینار کو دکنی کے نامور ہندی اسکالر اور محقق ڈاکٹر سری رام شرما نے بھی مخاطب کیا۔ آپ نے دکنی میں تحقیق کی روایات اور لسانی ہم آہنگی پر اظہار خیال کرتے ہوئے دکنی کی ابتدائی نثر اور شاعری میں ہندوستانی کلچر کی مثبت پذیرائی پر روشنی ڈالی اور کہا کہ گزشتہ پانچ سو سال سے دکنی زبان کے ادب نے قومی تقاضوں کو روشن رکھا ہے اور دکنی کی بیشتر روایات مختلف اصناف ادب میں آج بھی اردو ادب کا اٹوٹ سرمایہ بن چکی ہیں۔ ڈاکٹر شرما نے دکنی کے اسکالروں کو مشورہ دیا کہ وہ ان روایات کی توسیع اور دکنی ادب کے کلاسیکی سرمایہ کی نظر ثانی کر کے تحقیق کے عصری تقاضوں کی تکمیل کریں ۔ اس موقع پر جناب مصلح الدین سعدی اور ڈاکٹر حسینی شاہد نے چند سوالات کیے ۔ ڈاکٹر شاہد نے دکنی ادبیات کے ایک انسٹی ٹیوٹ کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے دکنی کے سب سے بڑے محقق ڈاکٹر زور کی خدمات کو خراج عقیدت ادا کیا اور کہا کہ ڈاکٹر زور نے دکنی ادبیات کی تحقیق اور جامعات میں دکنی کی تدریس اور اس کے مطالعہ کی ترویج میں نمایاں کردار ادا کر کے اسلاف کے عظیم کلاسیکی ورثہ کی حفاظت کا فرض انجام دیا ۔ ڈاکٹر حسینی شاہد نے دکنی ادبیات کی اشاعت و فروغ میں نواب سالار جنگ مرحوم کی خدمات کو بھی خراج ادا کیا ۔ مہاراشٹرا کے ممتاز اسکالر، مورخ اور دکنیات کے نظر شناس جناب دیوی سنگھ چوہان نے دکنی شاعری میں تعلّی کی روایت پر اپنے خیالات ظاہر کیے اور نصرتی، غواصی اور وجہی کے کلام سے مثالیں دیں اور کہا کہ عادل شاہی اور قطب شاہی دور حکومت میں دکنی شعر و ادب کو بے نہایت فروغ ہوا ۔ آپ نے اس امر پر زور دیا کہ دکنی زبان نے قومی اور تاریخی شعور کو عوامی سطح پر سمجھانے میں جو خدمات انجام دیں ہیں اس کی مثال کسی اور ہندوستانی زبان میں نہیں ملتی ۔ شمالی ہند میں دکنیات کے معتبر عالم ڈاکٹر نذیر احمد سابق صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے ابراہیم عادل شاہ ثانی کی "نورس" پر عالمانہ مقالہ سنایا اور اس کتاب کے متعدد نادر مخطوطات کے متن الکتابت اور مندرجات پر محققانہ اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ دکنی ادب میں تحقیق کا رجحان مولوی شمس اللہ قادری اور مولوی عبدالحق سے شروع ہوا ۔ اس روایت کو ڈاکٹر زور، پروفیسر سروری اور مولوی سید محمد نے وسیع منظر سے ہمکنار کیا۔ پروفیسر مسعود حسین خان نے جب عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی صدارت سنبھالی تو دکنی تحقیق کا نیا دور شروع ہوا ۔ ڈاکٹر قتیل نے دکنی تحقیق میں عثمانین اسکالروں کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر حسینی شاہد اور ڈاکٹر زینت ساجدہ کی ژرف نگاہی اور جزئیات تک کامیاب رسائی اور زبان کے تجزیہ میں ان کی زباندانی کو سراہا اور شاہد صاحب کی کتاب "الف الدین علی اعلیٰ" کو اہم دکنی کارنامہ قرار دیا جس سے دکنی تحقیق کی نئی سمت اور رفتار متعین ہوتی ہے ۔ سیمینار کے دوران جناب یشپال کپور (ایم پی)، چیرمین نوجیون و قومی آواز ٹرسٹ دہلی، جناب خواجہ عبدالغفور صاحب کے ہمراہ اردو ہال پہنچے ۔ ڈاکٹر سری رام شرما نے کپور صاحب کا خیر مقدم کرتے ہوئے

ان کی اُردو دوستی کو خراج تحسین ادا کیا۔ جناب لیشپال کپور نے ڈاکٹر ساجدہ کو ان کے جشن پر مبارکباد دیتے ہوئے حیدرآباد کے ادبی و شعری ماحول کو مثالی قرار دیا اور کہا کہ اُردو زبان کسی خاص طبقے کی میراث نہیں ہے اس کے گیسو سنوار نے میں غیر مسلم ادیبوں اور صحافیوں کا بھی حصہ رہا ہے۔ محترمہ رفیع رؤف نے سیمینار کی معتمدی کی۔

جشنِ زینت ساجدہ کا مقطع محفل مشاعرہ تھا۔ ۷ رجون کی رات جناب خواجہ عبدالغفور صاحب سکریٹری مہاراشٹرا اُردو اکیڈیمی کی صدارت میں اُردو ہال کے آڈیٹوریم میں شعر و سخن کی محفل آراستہ ہوئی۔ ڈاکٹر حسینی شاہد اور ڈاکٹر زینت ساجدہ شعراء کی صفوں میں رونق افروز تھے۔ ملک کے نامور سخنور شاذ تمکنت نے نظامت کے فرائض انجام دیئے اور شعراء برادری کی طرف سے زینت ساجدہ کے اعتراف خدمات کے اس جشن کے موقع پر اجتماعی تہنیت و مبارکباد پیش کی۔ با ذوق خواتین و حضرات کی اکثریت نے محفل مشاعرہ کو حیدرآباد کے ادبی ماحول کی اہم محفل قرار دیا۔ ابتدا محترمہ زبیدہ تحسین، پھر جناب رحمٰن جامی اور محترمہ حفیظ النساء بیگم حزیں نے زینت آپا کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ اس مشاعرہ میں حیدرآباد کے اساتذہ کے دوش بدوش ترقی پسند اور جدید نقطۂ نظر کے معروف شعراء نے کلام سنایا جن میں سعید شہیدی، شاذ تمکنت، خواجہ شوق، راشد آذر، علی احمد جلیلی، خیرات ندیم، بانو طاہرہ سعید، امان ارشد، س۔ ا۔ عشرت، صلاح الدین نیّر، رئیس اختر، وقار خلیل، رؤف خلش، علی الدین نوید، رحمٰن جامی، حسن فرخ، فیض الحسن خیال، رؤف خیر، ناصر کرنولی، برق یوسفی، عزیز النساء قبا، روشن خیال، نسیم نیازی اور بنگلور کے استھانہ سحر اقبال قابل ذکر ہیں۔ جناب شاذ کی شاعرانہ اور خوبصورت کمنٹری نے مشاعرے میں جان ڈال دی۔ ●

نیک تمناؤں کے ساتھ
آپٹیکل سینٹر سکندرآباد

Sree Rayalaseema Paper Mills Limited

TGL Buildings TGL Road ADONI

Kurnool Dist.

A Joint Venture of Andhra Pradesh Industrial Development Corporation and TGL Group of Industries, Adoni, producing and cattering to th Nation's needs of 42,000 MT of Paper per annum.

Plans are a foot for expansion to produce 58,500 MT per annum.

Social Forestry is a unique programme of our Mill to plant Subabul and Ucalyptus in 7500 hectares over a period of 5 years in our region with the financial assistance of NABARD. This programme helps to genarate the required raw-material to produce the required paper in our Mills. This programme has the future for its fortune and for the Nation's prosparity.

XX

Registered with the Registrar of Newspapers – Registered No. 8285/64

HSE : 6 | Phone : 52957

POONAM URDU MONTHLY

DR. ZEENATH SAJADA, Spl. Issue

Office : Azampura, Hyderabad-500024 | Editor : NASIR KURNOOLI' M.A.